وزیر آغا
دوسرا کنارا

دُوسرا کنارا

میرے انشائیوں کا تیسرا مجموعہ ہے جو میری زندگی کے ایک ایسے موڑ پر شائع ہو رہا ہے جس کے بعد شاید اور کوئی موڑ نہیں ہے۔ ساٹھ رنز بنا لینے کے بعد کرکٹ کے کھلاڑی کی جو نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے۔ وہی اَب مجھے حاصل ہے۔ نصف سنچری کے نازک مقام کو پار کیے مجھے اب ایک عرصہ ہو چکا ہے اور اس لیے اب وہ اضطراب اور گو مگو کا عالم باقی نہیں جو پچاس کے ہندسے تک پہنچنے کے موقع پر مجھے اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا۔ دوسری طرف سنچری کا نقطہ ایک نقطۂ موہوم نے اور اس تک پہنچنے کا نہ امکان ہے نہ آرزو! ساٹھ رنز بنا چکنے کے بعد کھلاڑی ایک طرح سے "آزاد" ہو جاتا ہے۔ نصف سنچری کیے بغیر آوٹ ہو جانے کے خدشہ سے آزاد، سنچری بنانے کی مضطرب خواہش سے آزاد، اشیا کو جذبات کی دھند میں سے دیکھنے کی روش سے آزاد! میرا خیال ہے کہ ساٹھ رنز بنا لینے کے بعد ہی انشائیہ نگاری کا مخصوص رویہ جنم لیتا ہے جو زندگی سے بیک وقت مربوط ہونے اور اس سے منقطع ہونے کی دوگونہ کیفیات سے عبارت ہوتا ہے یعنی سمندر کے لمس کو محسوس کرنے مگر سمندر کے سارے خروش کو ایک متبسم نگاہ سے دیکھنے کا رویہ!

میں یہ نہیں کہتا کہ لازمی طور پر ساٹھ کی منزل تو ایک نفسی کیفیت ہے جو زندگی کے کسی بھی دور میں (عارضی طور پر سہی) مصنف کو اپنی گرفت میں لے سکتی ہے اور وہ اس لمحۂ آزادی میں انشائیہ نگاری کی طرف مائل ہو سکتا ہے۔ البتہ ساٹھ کے ہندسے کو عبور کرنے کے بعد (بشرطیکہ قسمت یاوری کرے) یہ لمحۂ آزادی پھیل کر اُس کی ساری زندگی پر محیط ہو سکتا ہے اور پوری زندگی کی طرف اُس کا رویہ انشائی کیفیات کا حامل بن سکتا ہے۔ مَیں اب اُس مقام پر ہوں جہاں سے مَیں زندگی کو پہلی بار ایک تناظر میں دیکھ رہا ہوں۔

مَیں نے اپنے انشائیوں کے اس مجموعے کا نام "دوسرا کنارا" تجویز کیا ہے۔ آج سے کچھ عرصہ قبل مَیں نے اصغر ندیم سید کا ایک ٹیلی وژن ڈراما دیکھا تھا جس میں ایک کردار دوسرے سے کہتا ہے:

(بقیہ دُوسرے قلیب پر)

دوسرا کنارا

(انشائیے)

GOVT. URDU LIBRARY
19155
ACC. No.
28.11.85
Date

وزیر آغا

سیمانت پرکاشن
نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

(ہندوستان میں حقوق بحق نریندر ناتھ سوز محفوظ)

قیمت : چالیس روپے -/۴۰

سنِ اشاعت : ۱۹۸۵ء

تعداد : ایک ہزار

خطاطی : تمکین شیرازی

سرورق : فضیلت

طباعت جواہر آفسیٹ پرنٹرز - دہلی-۶

ناشر : نریندر ناتھ سوز

سیمانت پرکاشن

۹۲۲ - کوچہ روہیلا - تراہا بہرام - دریا گنج نئی دہلی-۲

DOOSRA KINARA WAZIR AGHA

INSHAIYE : 1985 : Rs. 40.00

SEEMANT PRAKASHAN

922 KUCHA ROHELLA

DARYAGANJ, NEW DELHI 110002

Govt. Urdu Library
19155

اُستادِ مکرّم

سیّد عبّاس حسُین زیدی کے نام

جائیں گے ہم بھی خواب کے اُس شہر کی طرف
ناؤ پلٹ تو آئے مُسافر اُتار کے

مصنف کے دوسرے انشائیوں کے مجموعے

خیال پارے (۱۹۶۰ء)

چوری سے یاری تک (۱۹۶۶ء)

ترتیب

دوسرا کنارا (پیش لفظ)	۷
بارہواں کھلاڑی	۱۷
حُقّہ پینا	۲۵
مُعافی مانگنا	۳۷
لاہور	۴۳
کھڑکی	۴۹
بسنت	۵۷
ٹھنڈا برف ہاتھ	۶۳
کُچھ مسکراہٹ کے بارے میں	۷۱
کتابوں کی معیت میں	۷۹
اکلاپا اور تنہائی	۹۷
میرا البم	۱۰۳
اِسم اور فعل	۱۰۹
چلنا	۱۱۵
ہجرت	۱۲۱
میرے بچپن کا دوست	۱۲۷
سائیسی علم دریاؤ !	۱۳۲
ہینڈ بیگ	۱۳۹

شام کے کھیتوں میں ننگے پاؤں چلنا چاہیئے
ہر طرف پھولوں کا سونا ہے یہاں بکھرا ہُوا

دُوسرا کنارا

—— میرے انشائیوں کا تیسرا مجموعہ ہے۔ اِس میں کُل سترہ انشائیے شامل ہیں جو پچھلے سولہ برس میں لکھے گئے ہیں۔ گویا سال میں ایک انشائیہ! یہی شاید انشائیہ کی رفتار بھی ہے —— رفتار، جو گھڑی کی ٹِک ٹِک سے مشابہ نہیں بلکہ فطرت کی اس رفتار کے مانند ہے جو پھُول کے چٹکنے اور اوس کے گرنے میں اپنا مظاہرہ کرتی ہے۔

میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ انشائیہ نگار ایک ایسے جزیرے کی طرح ہے جو چاروں طرف سے متواج سمندر میں گھرا ہوا ہو۔ چونکہ بیسویں صدی افکار و محسوسات کے اعتبار سے ایک متواج صدی ہے لہٰذا اس میں جا بجا جزیرے سے نظر آنے لگے ہیں یعنی ایسے تخلیق کار جو افکار کی جدّت اور جذبات کے کہرام کو محسوس تو کرتے ہیں مگر ان سے مغلوب نہیں ہوتے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ ایسے تخلیق کار جو اس قابل ہیں کہ وقفے وقفے سے رُک کر زندگی کے تلاطم پر ایک نظر ڈال سکیں۔ ویسے یہ وقفے وقفے سے رُکنا (یعنی متواج سمندر میں جزیرہ بن جانا) ہی انشائیہ کا اہم ترین وصف بھی ہے۔ رُکنے کے ان لمحات میں انشائیہ نگار نہ صرف اپنے بلکہ اپنے قاری کے ذہن کو بھی متحرک کرتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے "نئے نئے دروازے اور کھڑکیاں کھُل رہی ہوں اور لاکھوں امکانات تاریکی میں سے اُچک اُچک کر دیکھنے لگے ہوں"۔ اصلاً انشائیہ کا مقصد سُلانا نہیں بلکہ جگانا ہے۔ جذبے میں بہہ جانا نہیں بلکہ سوچ کو متحرک کرنا ہے۔ مگر سوچ کا یہ تحرّک جذبے اور احساس کی حدّت سے آشنا ضرور ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو انشائیہ ادب کے زُمرے ہی سے خارج ہو جائے اور کاروباری، فلسفیانہ یا سائنسی اندازِ نظر کا مظاہرہ کرنے لگے۔

بعض احباب نے مجھ سے یہ فرمائش بار بار کی ہے کہ میں انشائیہ کے خدّ و خال دکھاؤں اور میں نے اس فرمائش کی تعمیل میں متعدد مضامین لکھ کر انشائیہ کے امتیازی اوصاف کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعض دوسرے دوستوں کا یہ مطالبہ تھا کہ میں انشائیہ کی حدود کا تعین کروں اور اس کی ایک باقاعدہ "تعریف" پیش کروں۔ میں نے اس مطالبہ کو بھی پورا کیا اور لکھا کہ انشائیہ اس نثری صنف کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیاء یا مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طور گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آکر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ چونکہ کوئی بھی "تعریف" اُس وقت تک کارآمد نہیں ہوتی جب تک اس کی وضاحت نہ کی جائے لہٰذا میں نے اپنی پیش کردہ تعریف کی وضاحت کرتے ہوئے انشائیہ کے تین بنیادی اوصاف کی نشان دہی کی۔ میں نے لکھا کہ اس تعریف میں یہ بات مضمر ہے کہ انشائیہ ایک تو اسلوب یا انشا کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرے یعنی زبان کو تخلیقی سطح پر استعمال کرے۔ دوسرے شے یا مظہر کے اندر چھپے ہوئے ایک نئے معنی کو سطح پر لائے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی بُت تراش پتھر کی سِل پر سے فاضل بوجھ اتار کر اس کے اندر سے وہ شبیہہ برآمد کرے جو ظاہری آنکھ سے تو پوشیدہ تھی لیکن جسے بُت تراش کی باطنی آنکھ نے گرفت میں لے لیا تھا۔ تیسرے انشائیہ ذہن کو بیدار اور متحرک کرے یعنی یہ شعور کی توسیع کا اہتمام کرے۔ جب تک یہ تینوں باتیں یک جا نہ ہوں انشائیہ وجود میں نہیں آسکتا۔

میری اس پیش کردہ "تعریف" کے خلاف بعض ادبی حلقوں بالخصوص درسی نقادوں کے ایک گروہ نے ردِ عمل کا مظاہرہ کیا اور کہا کہ آغا صاحب نے انشائیہ کو محدود کر دیا ہے۔ اس ردِ عمل کی حمایت اُن لوگوں نے بڑے زوروں کے ساتھ کی جو اپنے مزاحیہ یا طنزیہ مضامین یا اخباری کالموں یا اصلاحی تحریروں کی پیشانیوں پر "انشائیہ" کا لفظ دیکھنے کے آرزومند تھے بعض ستم ظریفوں نے تو یہ تک کہہ دیا کہ انشائیہ اُمّ الاصناف ہے اور اس لئے اس کے

دائرے میں شاعری سے لے کر تنقید تک ہر قسم کی تحریر شامل کی جا سکتی ہے۔ کسی بھی صنف کو دریا برد کرنے کا یہ آسان ترین نسخہ ہے کہ اس کی حدود کو اس درجہ پھیلا دیا جائے کہ اس کا اپنا وجود، اپنا تشخص ہی باقی نہ رہے۔ لہٰذا میں نے عرض کیا کہ غزل، نظم اور افسانے کی طرح انشائیہ بھی ایک منفرد صنفِ ادب ہے۔ اگر آپ لوگ دوسری اصنافِ ادب کی حدود کا تعین کرنے پر اصرار کرتے ہیں اور ان کو "لا محدود" ہونے سے بچاتے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ آپ انشائیے کے ساتھ ہی "غریب کی جورو" والا سلوک روا رکھنے پر مُصر ہیں؟ اس بات کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، میں نے سوچا کہ انشائیہ کے امتیازی اوصاف کو نشان زد کرنے یا انشائیہ کی "تعریف" پیش کرنے سے شاید بات نہیں بنے گی کیونکہ "تعریف" کو رَٹ لینے سے کسی چیز کی پہچان تو نہیں ہو جاتی۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ لوگ باگ انشائیہ کی بالکل صحیح تعریف تو کر لیتے ہیں اور اس کے امتیازی اوصاف کو بڑی خوش اسلوبی سے پیش بھی کرتے ہیں لیکن جب پہچان کا مرحلہ آتا ہے تو ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ پچھلے دنوں مجھے ISAAC ASIMOV کے سائنسی مضامین کا ایک مجموعہ پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ مصنف نے کتاب کے دیباچے میں انشائیہ کی بالکل صحیح تعریف کی تھی اور پھر دعوےٰ کیا تھا کہ اس کے یہ مضامین انشائیہ کے زمرے میں شامل ہیں لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ ان مضامین کا انشائیہ سے دُور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ مصنف نے فقط یہ کیا تھا کہ ہر مضمون کے آغاز میں اپنی شخصی زندگی سے کوئی واقعہ شگفتہ انداز میں پیش کر دیا تھا۔ مگر اس کے فوراً بعد سائنسی معلومات کے ڈھیر لگا دیئے تھے۔ گویا مصنف انشائیہ کی تعریف کرنے پر تو قادر تھا لیکن اسے پہچاننے سے معذور تھا۔ یہی حال ہمارے اُن بعض مصنفین کا ہے جو انشائیہ کی "تعریف" تو کر لیتے ہیں لیکن جن کے انشائیے یا تو طنز و مزاح کی ذیل میں آتے ہیں یا پھر اصلاحی مقاصد کے بوجھ تلے کراہ رہے ہوتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ "جوابِ مضمون" کی سطح تک پہنچ پاتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ انشائیہ کو پہچانا جائے۔ اگر ہم میں سے اکثر لوگ غزل کے شعر کو قصیدہ کے شعر سے الگ کر کے پہچان

لینے پر قادر ہیں (حالانکہ ہیئت کے اعتبار سے غزل اور قصیدہ کے شعر میں کوئی فرق نہیں ہوتا) تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم انشائیہ کو اُن مضامین سے الگ نہ کر سکیں جو ہیئت کے اعتبار سے تو انشائیہ سے مشابہہ ہیں لیکن مزاج اور نوعیت کے اعتبار سے یکسر مختلف ہیں؟

میرے انشائیوں کا یہ مجموعہ میری زندگی کے ایک ایسے موڑ پر شائع ہو رہا ہے جس کے بعد شاید کوئی اور موڑ نہیں ہے۔ ساٹھ رنز بنا لینے کے بعد کرکٹ کے کھلاڑی کی جو نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے وہی اب مجھے حاصل ہے۔ نصف سنچری کے نازک مقام کو پار کئے مجھے اب ایک عرصہ ہو چکا ہے اور اس لئے اب وہ اضطراب اور گومگو کا عالم باقی نہیں جو پچاس کے ہندسے تک پہنچنے کے موقع پر مجھے اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھا۔ دوسری طرف سنچری کا نقطہ ایک نقطۂ موہوم ہے اور اس تک پہنچنے کا نہ امکان ہے نہ آرزو! - ساٹھ رنز بنا چکنے کے بعد کھلاڑی ایک طرح سے "آزاد" ہو جاتا ہے۔ نصف سنچری کئے بغیر آؤٹ ہو جانے کے خدشہ سے آزاد، سنچری بنانے کی مضطرب خواہش سے آزاد، اشیاء کو جذبات کی دُھند میں سے دیکھنے کی روش سے آزاد! — میرا خیال ہے کہ ساٹھ رنز بنا لینے کے بعد ہی انشائیہ نگاری کا مخصوص رویّہ جنم لیتا ہے جو زندگی سے بیک وقت مربوط ہونے اور اس سے منقطع ہونے کی دوگونہ کیفیات سے عبارت ہوتا ہے یعنی سمندر کے لمس کو محسوس کرنے مگر سمندر کے سارے خروش کو ایک متبسّم نگاہ سے دیکھنے کا رویّہ! میں یہ نہیں کہتا کہ لازمی طور پر ساٹھ کے نقطے پر پہنچنے کے بعد ہی انسان کے اندر سے انشائیہ نگار برآمد ہوتا ہے۔ ساٹھ کی منزل تو ایک نفسی کیفیت ہے جو زندگی کے کسی بھی دَور میں (عارضی طور پر سہی) مصنّف کو اپنی گرفت میں لے سکتی ہے اور وہ اس لمحۂ آزادی میں انشائیہ نگاری کی طرف مائل ہو سکتا ہے۔ البتہ ساٹھ کے ہندسے کو عبور کرنے کے بعد (بشرطیکہ قسمت یاوری کرے) یہ لمحۂ آزادی پھیل کر اُس کی ساری زندگی پر محیط ہو سکتا ہے اور پوری زندگی کی طرف اُس کا رویّہ انشائی کیفیات کا حامل بن سکتا ہے۔ میں اب اسی مقام پر ہوں جہاں سے میں زندگی کو پہلی بار ایک ایسے تناظر میں دیکھ رہا ہوں

کہ مجھے کائنات کے بڑے بڑے مظاہر کے علاوہ اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں اور چیزوں میں بھی ایک جہانِ معنی نظر آنے لگا ہے۔ مثلاً پرسوں کی بات ہے کہ کتابوں کا ایک پیکٹ بنانے کے لئے مجھے رسّی کی ضرورت پڑی۔ مگر جب رسّی ملی تو اس میں ایک مضبوط سی گرہ پڑی ہوئی تھی۔ میں کتنا ہی عرصہ اپنے ناخنوں کی مدد سے اسے کھولنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب کامیاب نہ ہوا تو اپنے دانتوں سے مدد طلب کی (الحمدللہ ابھی میرے دانت بقیدِ حیات ہیں) کتنا ہی عرصہ دانتوں نے پیچھے ہٹ ہٹ کر گرہ پر حملے کیے تب کہیں جا کر گرہ کھلی۔ میں نے دیکھا کہ جہاں گرہ تھی وہاں رسّی میں ایک سلوٹ سی پڑ گئی تھی۔ میں نے رسّی کو ذرا سا کھینچا، سلوٹ کو چند سے سہلایا اور گرہ رسّی کے اندر پوری طرح جذب ہو گئی۔ اچانک میں رُک گیا اور سوچنے لگا کہ گرہ کہاں گئی؟ اور تب ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ میرے ذہن میں آیا کہ میں خود بھی تو زندگی کی ڈور میں محض ایک گرہ ہوں اور میری طرح ہر شخص ایک گرہ ہے۔ جب گرہ کھل جاتی ہے تو وہ زندگی کی ڈور میں جذب ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصہ کے لئے ایک سلوٹ سی ضرور باقی رہتی ہے (جس پر لوگ ازراہِ محبت پھول بھی بچھاتے ہیں) مگر پھر آہستہ آہستہ وہ بھی غائب ہو جاتی ہے۔ تب میں نے اپنے چاروں طرف ایک نظر دوڑائی۔ ساری خلقِ خدا، سیاہ سفید، پتلی موٹی، کسی ہوئی یا ڈھیلی ڈھالی گرہوں کی صورت میں بکھری پڑی تھی اور زندگی اور موت کا ڈراما یکایک مجھے ایک اور ہی روشنی میں دکھائی دینے لگا تھا۔ مگر یہ تو میں نے محض ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ ساٹھ کے سنگِ میل کے بعد معنویت سے لبریز مظاہر اور واقعات قدم قدم پر نظر آنے لگتے ہیں مثلاً آج کل میں طوطوں کے ہاتھوں نالاں ہوں۔ میرے سورج مکھی کے کھیت پر طوطوں کا "ظالم سماج" ہر آن حملہ آور ہے۔ ہرے ہرے سرخ چونچوں اور گول آنکھوں والے ایک جیسے لاتعداد طوطے جٹ ہوائی جہازوں کی طرح سورج مکھی کے کھیت پر گرتے ہیں اور اگر انہیں ڈرا دھمکا کر اڑایا نہ جائے تو فصل کو چٹ کر جاتے ہیں۔ مجھے یہ طوطے بہت بُرے لگتے ہیں۔ میرا بس چلے تو ان میں سے ہر ایک کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر دم لوں۔ مگر کیا کروں میرا بس ہی نہیں چلتا۔ میرے لئے یہ طوطے دشمن کے

سپاہی ہیں۔ ایک سی وردی، ایک سی عادت، ایک سا طریقِ کار! میں ان لاتعداد طوطوں کو بطور ایک ڈار یا پلٹن تو جانتا ہوں مگر ان میں سے کسی خاص طوطے سے واقف نہیں ہوں۔ تاہم میرے گھر کے برآمدے میں شہتیر سے ملحقہ ایک چھوٹے سے سوراخ میں ایک طوطا اور طوطی بہار کی چھٹیاں گزارنے آئے ہوئے ہیں۔ دونوں میاں بیوی اکثر اپنے گھر سے باہر آکر منڈیر پر بیٹھ جاتے ہیں اور امریکی فلموں کے ہیرو ہیروئن کی طرح تادیر بوس وکنار میں مصروف رہتے ہیں۔ طوطے کو میں اب پوری طرح پہچاننے لگا ہوں۔ اس کی چال ڈھال ایک خاص طرح کی ہے۔ بایاں پاؤں کبھی زخمی ہوا ہوگا، اس لئے وہ کچھ مُڑا ہوا ہے اور لارڈ بائرن کی یاد دلاتا ہے۔ ایک پر بھی کچھ ٹوٹا ہوا سا ہے یقیناً موصوف نے کسی اور طوطے سے کوئی DUEL لڑا ہوگا۔ میرے لئے اب یہ طوطوں کی فوج کا ایک سپاہی نہیں بلکہ میاں مٹھو ہے جس کی اپنی شخصیت، اپنا نام اور اپنی خانگی زندگی ہے۔ میں اب اس میاں مٹھو سے اس درجہ مانوس ہو گیا ہوں کہ وہ مجھے دشمن کا بے چہرہ اور بے نام سپاہی نظر نہیں آتا بلکہ اپنے ہی دوستوں میں سے ایک دکھائی دیتا ہے (اپنے دوستوں سے معذرت کے ساتھ) یکایک میرے ذہن کو تحریک ملتی ہے اور میں لحظہ بھر کے لئے رُک کر سوچتا ہوں کہ ساری اجنبیت فاصلے کی پیداوار ہے۔ ہماری تمام تر دشمنیاں، نفرتیں اور غلط فہمیاں محض اس لئے ہیں کہ جس شخص کے خلاف ہم انہیں استعمال کر رہے ہیں، وہ ہم سے کوسوں دُور محض ایک بے نام اور بے چہرہ تجرید ہے۔ اگر وہ کسی نہ کسی طرح ہمارے قریب آجائے تو پھر وہ ریاضی کا ایک ہندسہ نہیں رہے گا بلکہ ایک منفرد ہستی بن جائے گا۔ یعنی اگر فاصلہ منہا ہو جائے تو دُھند کی تجرید چھٹ جاتی ہے اور تجسیم کی اپنائیت اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ میں سوچنے لگا ہوں کہ اگر امریکہ کا صدر اور رُوس کا سربراہ ہزاروں میل کے فاصلے سے ایک دوسرے پر حقارت اور نفرت کے میزائل چلانے کے بجائے چند دنوں کے لئے سوئٹزرلینڈ کے کسی پہاڑی ہوٹل میں اپنے اپنے بال بچوں سمیت اکٹھے ہو کر بہار کی چھٹیاں گزاریں اور سیاسی جوڑ توڑ اور داؤ پیچ سے دست کش ہو کر اپنے بچوں اور بچوں کے بچوں کے مستقبل کے بارے میں ایک دوسرے سے تبادلۂ خیالات کریں تو شاید اس

کرۂ ارض پر سے جنگ کے گہرے بادل چھٹ جائیں اور انسان عافیت کا سانس لینے میں کامیاب ہو جائے۔

وقت کی گزران کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہر شے جسے انسان نے اوّل اوّل مسرت اور حیرت کے ساتھ دیکھا تھا، اب اُسے پٹی ہوئی، پامال اور پیش پا افتادہ نظر آنے لگتی ہے حتّٰی کہ موسموں کا مد و جزر، دن رات کی گردش اور زندگی اور موت کا ڈراما بھی اُسے پُرانا، فرسودہ، ہزاروں لاکھوں بار کا دہرایا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ جب انسان کو ہر طرف تکرار ہی تکرار نظر آئے تو اُس پر غنودگی طاری ہو جاتی ہے۔ اسی کو بوریت بھی کہا گیا ہے جو براہِ راست مشینی تکرار سے پیدا ہوتی ہے۔ ہر مشین تکرار کا منظر پیش کرتی ہے اور تکرار چاہے وہ مشین کی ہو، نظریئے کی ہو یا لفظ کی، انسان کے شعور کو معطل کر کے اُسے سو جانے پر مائل کرتی ہے۔ انشائیہ کا وصف یہ ہے کہ وہ تکرار کے اس دائرے کو توڑتا ہے اور جس ہتھیار سے اسے توڑتا ہے وہ ہے ایک عالمِ حیرت! حیرت کا کام یہ ہے کہ وہ جگاتی ہے، سُلاتی نہیں ہے، وہ بیداری کا نقطۂ آغاز ہے اور بیداری کا مطلب یہ ہے کہ انسان ہر چیز کو اس طور دیکھے جیسے وہ اسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ میں خود عالمِ حیرت سے کبھی محروم نہیں رہا لیکن اب کچھ عرصہ سے ایک مستقل نوعیت کے عالمِ حیرت میں ہوں۔ مجھے ہر معمولی چیز بھی ایک معجزہ سے کم نظر نہیں آتی حتّٰی کہ جب اپنے جسم کی طرف دیکھتا ہوں تو اس کی پُراسراریت پر بھی حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا ہوں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میں تو پلاسٹک کے اس تھیلے کی بالائی سطح پر ہی براجمان ہوں اور مجھے قطعاً اس بات کا علم نہیں ہے کہ اس تھیلے کے اندر کس پُراسرار طریق سے غذا لہو میں تبدیل ہوتی ہے یا حملہ آوروں کے خلاف مدافعتی جنگیں کن نازک ہتھیاروں سے لڑی جاتی ہیں اور ہر عضو کس طرح کیمیائی پیغامات یا احکامات وصول کر کے ایک مخصوص کارکردگی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ سوچتا ہوں یہ سب کچھ کس قسم کے نظام کے تابع ہے اور اس نظام کے سامنے کون سے اعلیٰ و ارفع مقاصد ہیں۔ باہر کی طرف نظر دوڑاتا ہوں تو زندگی کا ہر مظہر محض زندہ رہنے کے لئے ایک زبردست تگ و دو میں مصروف ہے۔

پوری زندگی موت کے اعصابی خوف میں مبتلا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہر درخت ہزاروں لاکھوں بیج پیدا کرنے کا اہتمام کیوں کرتا اور مادۂ تولید کی محض ایک بُوند میں کروڑوں انسانی جرثومے کیوں تڑپ رہے ہوتے۔ یوں لگتا ہے جیسے زندگی کسی قسم کا کوئی RISK لینے کے لئے تیار نہیں۔ اس کے سامنے صرف ایک ہی مقصد ہے یعنی کسی نہ کسی طرح اگلی نسل کو پیدا کیا جائے تاکہ موت کو شکست دی جاسکے۔ گویا زندگی کا واحد مقصد ہے۔ "باقی" رہنا کیوں ؟۔ میرے پاس اِس "کیوں" کا کوئی جواب نہیں ہے مگر میں زندگی کی اس ساری عظیم کارکردگی کو حیرت سے ضرور دیکھتا ہوں اور پھر تبسم زیرِ لب کے ساتھ اس پر غور و فکر کرتا ہوں۔ یہ تبسم زیرِ لب جو عرفان کا لطیف ترین ثمر ہے، انشائیہ کا ثمرِ شیریں بھی ہے!

ایک سوال مجھ سے یہ بھی پوچھا گیا ہے کہ انشائیہ کی ہیئت کیا ہے؟ اور میں نے جواباً عرض کیا ہے کہ انشائیہ کی کوئی مخصوص ہیئت نہیں ہے حتیٰ کہ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ اسے لازمی طور پر مضمون کے اسلوب ہی میں لکھا جائے۔ بعض اوقات افسانوی پیرائے کو بھی انشائیہ نے اختیار کیا ہے (مثلاً ورجینیا وولف کا ڈتھ آف دی موتھ) مگر اس طور کہ وہ افسانہ نہیں بنا بلکہ بنیادی طور پر انشائیہ کے مزاج ہی کا حامل رہا ہے۔ اسی طرح انشائیہ پیرایۂ اظہار کے کسی خاص رنگ کا بھی مطیع نہیں۔ اپنی اپنی طبیعت اور مُوڈ کی بات ہے۔ اگر آپ کسی لمحے خوش ہیں تو مسرت انشائیہ کے ہر بُنِ مو سے پھوٹتی ہوئی محسوس ہوگی۔ اگر آپ ہنسانے کے موڈ میں ہیں تو مزاح اس کی بُنت میں شامل ہو جائے گا۔ اگر آپ دوسروں پر ہنسنے کے موڈ میں ہیں تو طنز کی کارفرمائی صاف نظر آجائے گی اور اگر آپ تخلیقی سوچ کی زد میں ہیں تو انشائیہ پر سنجیدگی کا ایک لطیف سا پردہ آجائے گا۔ مگر ان تمام صورتوں میں انشائیہ تخلیقی تازگی کا بہر حال ضرور مظاہرہ کرے گا۔ اگر وہ ایسا نہ کرسکے اور ایک پٹے ہوئے، سپاٹ اور بے ذائقہ اسلوب کو اپنائے تو انشائیہ کی اوّلین شرط ہی کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ افسانوی مزاحیہ، طنزیہ یا فکری انداز کو اختیار کرنے کے باوجود انشائیہ پر لازم ہے کہ وہ خود

کو افسانہ، مزاحیہ، طنزیہ، یا سنجیدہ مضمون بن جانے کی اجازت نہ دے اور ہر حال اور ہر صورت میں اپنے اصل مزاج کو قائم رکھے۔ گویا انشائیہ خارجی ہیئت کی بہ نسبت اپنی داخلی ہیئت کا زیادہ پابند ہے۔ انشائیہ کی پرکھ کے سلسلے میں اس داخلی ہیئت کا ادراک بہت ضروری ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ لوگ زیادہ تر انشائیہ کی خارجی ہیئت کے سلسلے میں ایک دوسرے سے متصادم دیکھے گئے ہیں۔ انشائیہ کو پہچاننے کی کوشش انہوں نے بہت کم کی ہے۔ حالانکہ جس طرح ہم ہزاروں اشعار میں سے غزل کے شعر کو فی الفور پہچان لیتے ہیں اسی طرح ہمیں اس قابل بھی ہونا چاہیئے کہ ہم طنزیہ مزاحیہ مضامین، اخباری کالموں اور جواب مضمونوں کے ڈھیر میں سے انشائیہ کو پہچان کر الگ کر سکیں اور پھر دوسروں کو دکھا سکیں۔

میں نے اپنے انشائیوں کے اس مجموعے کا نام "دوسرا کنارا" تجویز کیا ہے۔ آج سے کچھ عرصہ قبل میں نے اصغر ندیم سید کا ایک ٹیلی وژن ڈراما دیکھا تھا جس میں ایک کردار دوسرے سے کہتا ہے: "کبھی دوسرا کنارا بھی تو دیکھنا چاہیئے!" بعد ازاں جب ایک روز اصغر ندیم سید سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا کہ صاحب! آپ نے تو ایک لمحۂ خود فراموشی میں، انشائیہ کے اصل مزاج ہی کو پیش کر دیا کیوں کہ انشائیہ "دوسرے کنارے" کو دیکھنے ہی کی ایک کاوش تو ہے۔ مراد محض یہ نہیں کہ آپ دریا کا پل عبور کر کے دوسرے کنارے پر پہنچیں اور پھر اس سے لطف اندوز ہوں۔ اپنی جگہ یہ بات بھی غلط نہیں۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ جب آپ دوسرے کنارے پر پہنچتے ہیں تو آپ کا ہر روز کا دیکھا بھالا "پہلا کنارا" دوسرا کنارا بن کر آپ کے سامنے ابھر آتا ہے اور آپ اسے حیرت اور مسرت کے ساتھ دیکھنے لگتے ہیں جیسے پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔ انشائیہ نگار بالکل یہی کچھ کرتا ہے۔ وہ شے یا منظر کو سامنے سے دیکھنے کے بجائے عقب سے اس پر ایک نظر ڈالتا ہے۔ یوں اس کی اُس معنویت کو گرفت میں لے لیتا ہے جو ہمہ وقت ایک ہی مانوس زاویے سے مسلسل دیکھنے کے باعث اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ مثلاً ابھی ابھی میں نے دریا کا ذکر کیا تو معاً میرا ذہن "پانی کی طرف منتقل ہو گیا۔ پانی سے ہر شخص اس درجہ مانوس

ہے کہ کبھی اُس نے پانی کو "دوسرے کنارے" سے دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی لیکن میں نے ذہن کے دوسرے کنارے سے اس پر ایک نگاہ ڈالی ہے تو اچانک مجھ پر اس بات کا انکشاف ہوا ہے کہ پانی ہمارے کرۂ ارض کی کرنسی ہے۔ جب بارشوں کا زمانہ آتا ہے تو پانی " افراطِ زر " کا منظر دکھاتا ہے۔ تب وہ خود تو سستا ہو جاتا ہے مگر باقی اشیا مہنگی ہو جاتی ہیں۔ جب پانی بہت زیادہ ہو جائے تو طوفانِ نوحؑ کی طرح ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ تب پانی سے اُبھری ہوئی ایک معمولی سی پہاڑی بھی سونے کے پہاڑ جتنی قیمتی نظر آتی ہے۔ دوسری طرف جب برفانی یلغار کا زمانہ آتا ہے تو پانی برف کے FIXED DEPOSITS میں منتقل ہو جاتا ہے اور پانی کی کرنسی انقباضِ زر کا منظر دکھانے لگتی ہے۔ تب پانی مہنگا اور باقی تمام اشیا سستی ہو جاتی ہیں۔ ہمارا کرۂ ارض پانی کے "افراطِ زر" اور "انقباضِ زر" کے مراحل سے بار بار گزرا ہے۔ جب پانی کی فراوانی ہوئی تو زندگی کی بھی افراط ہو گئی۔ جب پانی کم ہوا تو زندگی بھی قحط سالی کی زد میں آ گئی۔ پانی اور زندگی کا یہ تعلق پہلے کبھی اس انداز سے میرے سامنے نہیں آیا تھا۔ یہ — "دوسرے کنارے" کا کرشمہ ہے کہ اس نے مجھے دیکھنے کا ایک نیا زاویہ عطا کیا۔

میں نے جب جمیل آذر، سجاد نقوی، خورشید رضوی اور سلمان بٹ سے کتاب کے اس عنوان کا ذکر کیا تو وہ خوش ہو گئے۔ غلام جیلانی اصغر چُپ رہے۔ البتہ انور سدید صاحب کے ہونٹ ایک عارفانہ تبسم میں بھیگتے چلے گئے۔ اب اس کا جو مطلب بھی اخذ کر لیا جائے۔ بہرحال میں اپنے احباب کے اس ردِ عمل سے صرفِ نظر کرتے ہوئے عنوان کا گیند قارئین کی کورٹ میں لڑھکانے کی جسارت کرتا ہوں۔

وزیر آغا

وزیر کوٹ

بارہواں کھلاڑی

کل ٹیلی وژن پر کرکٹ میچ دیکھتے ہوئے میرے ایک دوست نے اپنی آنکھوں میں ایک شریر چمک اور ہونٹوں پر ایک مکروہ سی پان زدہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے دفعتاً مجھ سے سوال کیا: "آغا جی! اگر آپ کو قومی کرکٹ ٹیم میں شامل ہونے کی دعوت ملے تو کیا آپ اسے قبول کر لیں گے؟" — میں نے فوری طور پر اس غلیظ سوال کا جواب دینے کے بجائے پہلے ایک اچٹتی سی نگاہ اپنے ہاتھوں پر ڈالی جن پر وقت اپنی لکیریں چھوڑ کر جا چکا ہے بعینہٖ جیسے سمندر پیچھے کو ہٹ جائے تو اس کے ریتلے ماتھے پر برہم سی سلوٹیں باقی رہ جاتی ہیں۔ پھر میں نے ایک لمبی سانس لی اور چاہا کہ سانس چند لمحے میرے سینے میں مہمان رہے لیکن اس نے اندر جاتے ہی جانے کس مہنجوڈرو کے آثار دیکھ لئے کہ پل بھر بھی نہ رُکی اور فوراً نتھنوں کے راستے باہر آگئی۔ تب میں نے ایک آہِ سرد کھینچی اور پورے اعتماد کے ساتھ اپنے دوست کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

"ایک شرط پر"

"وہ کیا؟" دوست نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہ یہ" میں نے قدرے توقف کیا اور پھر زور دے کر کہا: "وہ یہ کہ مجھے بارہویں کھلاڑی کا منصبِ جلیل عطا کیا جائے۔ بصورتِ دیگر میں قومی مفاد کی پرواہ کئے بغیر ٹیم میں شامل ہونے کی دعوت کو مسترد کر دوں گا"

میرا یہ جواب سُن کر میرے دوست کی آنکھوں سے شرارت کی رمق اور ہونٹوں سے تبسم کی نمی آنِ واحد میں رُخصت ہو گئی۔ غالباً وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس شخص کو بارہویں کھلاڑی کی حیثیت میں بھی شامل کیا گیا تو ٹیم کو یقینی شکست سے کوئی نہ بچا سکے گا۔ مگر دوسری طرف میں مطمئن تھا کہ میں نے ایک ایسی بات کہہ دی تھی جس میں ہزاروں انسانی نسلوں کا تجربہ کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوا تھا مگر جس تک میرے دوست کی رسائی قیامت تک بھی ممکن نہیں تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اس بھلے آدمی کو تو یہ تک معلوم نہیں کہ ٹیم کے گیارہ کے گیارہ کھلاڑی دراصل "مشقتی" ہیں جو بارہویں کھلاڑی کی تفریحِ طبع کے لئے میدان میں اُترتے ہیں۔ وہ سارا عرصہ میدان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑتے ہیں اور دوڑ دوڑ کر نڈھال ہو جاتے ہیں۔ محض اس لئے کہ دو کوڑی کی اُس بدنما گیند کو دبوچ سکیں جسے مخالف ٹیم کے کسی بددماغ بلا باز نے ہوا میں اُچھال دیا تھا یا پورا ایک فرلانگ سرپٹ دوڑنے کے بعد گیند کو اس طرح پھینکیں کہ لکڑی کی تین بدوضع نلکیوں میں سے کم از کم ایک اس کی زد میں ضرور آ جائے یا بلے کی مدد سے گیند کو خلقِ خدا کے سروں کے اُوپر سے گزارنے کا اہتمام کریں۔ سوچئے کس درجہ مضحکہ خیز حرکات ہیں۔ مگر بارہواں کھلاڑی ایک بڑی حد تک ان جملہ حرکات سے محفوظ اور قعرِ دریا کے درمیان "تختہ بند" ہونے کے باوجود ہوشیار رہتا ہے اور اپنا دامن تر نہیں ہونے دیتا۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ طبعًا محض ایک تماشائی ہے۔ وہ کرکٹ کے میدان میں ضرور اُترتا ہے مگر اُس وقت جب کسی کھلاڑی کو پیراسٹامول کی ایک آدھ گولی پہنچانا درکار ہو یا اُسے تیز باؤلنگ سے بچاؤ کی وہ ترکیب بتانا مقصود ہو جو خاندانی نسخے کی طرح صرف کپتان ہی کو معلوم ہے لیکن جس پر خود کپتان کو اپنی باری میں عمل کرنے کی توفیق نہ ہو سکی تھی یا جب کپتان محسوس کرے کہ اگر بارہواں کھلاڑی میدان میں جاکر دو چار بے معنی دوڑیں نہیں لگائے گا تو اس کی صحت بالکل برباد ہو جائے گی۔ باقی تمام عرصہ یہ "مردِ مجاہد" کھلاڑیوں کی گیلری میں براجمان بڑے مزے سے بازیچۂ اطفال کو دیکھتا ہے، مونگ پھلی کھاتا ہے یا اُچک اُچک کر ٹیلی وژن کیمرے کی زد میں آنے کی کوشش کرتا ہے تاہم اُس کی اصل حیثیت ایک تماشائی ہی کی رہتی ہے اور کسی بھی کھیل میں یہی بنیادی اور مرکزی حیثیت ہے۔

ممکن ہے آپ سوچیں کہ بارہویں کھلاڑی کو تماشائی قرار دینا تماشائیوں کے جمِ غفیر سے ناانصافی کے مترادف ہے۔ مگر آپ یقین کریں کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ کیونکہ تماشائی "تماشائی" ہوتے ہی کب ہیں۔ وہ تو اپنی اپنی ٹیم کے غیر حاضر کھلاڑی ہیں جو میچ کے دوران سارا وقت باؤلروں کے ساتھ باؤلنگ اور بلّا بازوں کے ساتھ بیٹنگ کرتے ہیں اور کبھی کبھار جب طبیعت ذرا مائل ہو تو وکٹ کیپنگ بھی کرتے ہیں۔ جب مخالف ٹیم کے بلّا باز کی گیند ہوا میں اُچھلتی ہے تو اسے دبوچنے کے لئے ہزاروں نادیدہ ہاتھ از خود ہوا میں اُٹھ جاتے ہیں اور جب ٹیم کے سب سے ہونہار اور خوبصورت کھلاڑی کے دونوں ہاتھوں میں موجود کسی مستقل سوراخ

سے گیند پھسل کر زمین پر آ رہتی ہے تو انہیں یوں لگتا ہے جیسے گیند خود ان کے ہاتھوں سے پھسلی ہے۔ پھر جب کبھی ان کی اپنی ٹیم کا بلا باز چھکّا لگاتا ہے تو ان کے ہزارہا بازوؤں کا زور بلّا باز کے بازو میں سمٹ آتا ہے۔ وہ اپنی ٹیم کی فتح و شکست میں اس درجہ "مبتلا" ہوتے ہیں کہ اگر ٹیم جیتے تو یہ ان کی ذاتی جیت ہے اور اگر ٹیم ہارے تو یہ ان کی ذاتی شکست ہے۔ کھیل دیکھنے والوں کا یہ مجمع حقیقتاً ایک ایسی "ہستی" ہے جس کے ہزاروں سر اور بازو ہیں جس کی لا تعداد آنکھیں اور انگنت کان ہیں اور جو بیک زبان اپنی خوشی، غمی یا برہمی کا برملا اظہار کرتی ہے اور کھیل میں بھرپور شرکت سے یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ بیچ میدان کھڑی ہے نہ کہ کرچ کرچ ہو کر گراؤنڈ کے چاروں طرف کی نشستوں پر بکھری پڑی ہے۔ یہ "ہستی" بیک وقت اپنی ٹیم کی ہم زاد، ساتھی، منصف اور ضمیر کی آواز ہے۔ لہٰذا جب کوئی کھلاڑی میدان میں کسی نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس ہستی کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھتا ہے اور جب اُس سے کوئی حماقت، یا کوتاہی سرزد ہوتی ہے (جو اکثر ہوتی ہے) تو یہ ہزار پایہ ہستی اُس کی طرف گھور کر دیکھتی ہے اور وہ اس کی برہم آنکھ کی تاب نہ لا کر فوراً ہیلمٹ میں اپنا منہ چھپا لیتا ہے۔ گویا ان دونوں میں "گفتگو" ہمہ وقت جاری رہتی ہے۔ اگر گفتگو کا یہ سلسلہ کسی وجہ سے ٹوٹ جائے تو میچ قطعاً بے معنی اور بے لطف ہو کر رہ جائے۔ بلکہ میں تو یہ تک کہوں گا کہ گیارہ افراد کی ٹیم اِس ہزار پایہ اوکٹوپس (OCTOPUS) سے ایک جذباتی رشتے میں منسلک ہوتی ہے۔ خوشی غم، غصّہ اور ہیجان — ان سب میں یہ دونوں ایک ساتھ شرکت کرتے ہیں، اور ایک دوسرے کی تلافی قرار پاتے ہیں۔ لہٰذا ان میں سے کوئی بھی "تماشائی" نہیں۔

دونوں مُبتلائے عشق ہیں۔

دوسری طرف بارہواں کھلاڑی ایک مردِ آزاد ہے۔ اُس کی بلا سے اگر ٹیم ہارے یا جیت سے سرفراز ہو۔ اگر ٹیم خدانخواستہ جیت گئی تو اُس کے گلے میں کوئی ہار پہنانے نہیں آئے گا اور اگر ٹیم ہار گئی تو اُس سے کوئی باز پُرس نہیں کرے گا۔ اُسے دیکھ کر "شیم شیم" کے نعرے نہیں لگائے گا اور اُس پر سنگترے کے چھلکے نہیں پھینکے گا۔ یہ شخص ٹیم کی فتح و شکست ہی سے بے نیاز نہیں بلکہ اپنی کارکردگی کے بارے میں بھی کسی خوش فہمی کا شکار نہیں۔ اُسے معلوم ہے کہ کوئی سر پھرا اُسے "مین آف دی میچ" کا اعزاز نہیں دے گا اور کوئی اخبار اس کی صحت یا علالت کے بارے میں اپنے قارئین کو مطلع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرے گا۔ بارہواں کھلاڑی راہ و رسمِ عاشقی کے ان جُملہ نازک مقامات سے قطعاً محفوظ ہے۔ وہ میچ کے پانچوں دِن اپنی نیند سوتا اور اپنی نیند جاگتا ہے۔ خوش خوراکی کے معاملے میں بھی اُسے کسی احتیاط کی ضرورت نہیں۔ کپتان کی تعریف یا سرزنش سے بھی اُسے کوئی سروکار نہیں۔ غرضیکہ بارہواں کھلاڑی، کھلاڑی کہلانے کے باوصف اپنی ٹیم کی تمام تر ذمہ داریوں سے سبکدوش اور اس کی تمام تر دھڑکنوں سے بے نیاز ہے۔ یہی تماشائی کا اصل منصب بھی ہے کہ وہ تماشہ میں شریک ہونے کے باوجود تماشہ سے الگ بھی رہے۔

بارہویں کھلاڑی کی لوحِ دل ہر قسم کے نقش اور نام سے بھی محفوظ ہے۔ وہ کمال بے نیازی سے اُن خوش وضع کھلاڑیوں کو دیکھتا ہے جو نازک سی بیاضوں پر کلکِ گوہریں کا جادو جگاتے ہیں اور جن کے خود نوشت دستخطوں پر جُھکی ہُوئی اُن

کی مسکراہٹ لمحہ بہ لمحہ وکٹیں گراتی چلی جاتی ہے۔ بارہویں کھلاڑی کو اپنی آنکھوں کے سامنے شب و روز ہونے والے اس بیہودہ ناٹک سے کوئی سروکار نہیں بعض اوقات تو وہ اس ساری کارگزاری کو بھی میچ ہی کا حصّہ سمجھتا ہے۔ اور پھر اس کی طرف سے منہ موڑ کر دوبارہ مونگ پھلی کھانے لگتا ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ بیاض پر دستخط کا حصول تو محض ایک بہانہ ہے۔ اس کے پیچھے وہی کاروباری رویّہ موجود ہے جو میچ دیکھنے کو میچ میکنگ کے لئے ایک زینہ بنانے کا متمنّی ہے اور وہی جبلّت کارفرما ہے جو بقائے بہترین کے لئے موزوں انتخاب کو ناگزیر قرار دیتی ہے۔ اُسے محسوس ہوتا ہے کہ شکاری خود شکار ہو رہا ہے۔ بے چارہ شکاری!

بارہواں کھلاڑی اصلاً ایک صوفی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ دُنیائے رنگ و بُو یہ ہر لمحہ صُورت بدلتا ہوا جیون، یہ شادیانے، پٹاخے، چیخیں اور قہقہے۔ یہ سب کچھ بے معنی ہے! یہ کرکٹ کے میدان میں بنائی جانے والی اور بعد ازاں نامۂ اعمال میں لکھی جانے والی وکٹیں، کیچ اور سنچریاں محض ایک فریبِ نظر ہے۔ کھیلنے والوں کے علاوہ دیکھنے والوں کو بھی اس بات کا پوری طرح احساس نہیں کہ پانچ روز پر پھیلی ہوئی مہابھارت کی یہ جنگ ایک بے نتیجہ پیکار ہے۔ اس میں نہ کسی کا کچھ بگڑتا ہے اور نہ کسی کو کچھ حاصل ہوتا ہے۔ اگر کچھ حاصل ہوتا ہے تو فقط سانس رُکنے کا وہ لمحہ جب آسمان سے اُترتی ہوئی سنہری گیند کھلاڑی کے دست بدعا ہاتھوں کی طرف آتی ہے اور پھر جیسے ہوا میں معلّق سی ہو کر رہ جاتی ہے اور دیکھنے والوں کے دل چند لمحوں کے لئے دھڑکنا ہی بھول جاتے ہیں۔ مگر بارہواں کھلاڑی کوئی تارکِ الدنیا نہیں اور نہ اُسے رہبانیت کا مبلّغ ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

وہ اس شخص کی طرح نہیں جو اپنے گھر بار کو خُدا پر چھوڑ کسی درخت کے نیچے دھُونی رُما کر اپنے تئیں اس خوش فہمی میں مُبتلا ہو جاتا ہے کہ اُس نے دُنیا کو ترک کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ دُنیا کو ترک کر بھی دے تو دُنیا اُسے ترک نہیں کرتی۔ دُنیا کا سب سے بڑا ایجنٹ یعنی جسم، خواہشات کے ہتھیاروں سے لیس اُس پر ہر وقت پیرِ تسمہ پا کی طرح سوار ہے۔ وہ چند دنوں یا مہینوں اِس پیرِ تسمہ پا کو چکمہ دینے میں کامیاب ہو بھی جائے تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ آخر آخر میں اُس پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ اس بارہویں کھلاڑی سے جان چھڑانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اسی لئے ایک سچا صوفی کبھی ترکِ دُنیا کا منصوبہ نہیں بناتا۔ وہ ترکِ دُنیا کے عمل کو نفرت کی نظروں سے دیکھتا ہے اور اِسے احساسِ شکست پر مُنتج قرار دیتا ہے۔ سچا صوفی تو بیچ منجدھار ایک لائٹ ہاؤس کی طرح بالکل شانت کھڑا رہتا ہے یعنی بیم موج سے آشنا تو ہوتا ہے مگر موج کو نوکِ پا سے ٹھکرانے میں لذت بھی محسوس کرتا ہے۔ بس یہی اصل بات ہے کہ آپ انبوہ میں رہتے ہوئے بھی اکیلے ہوں۔ مطلب یہ کہ آپ ایک سچے تماشائی کے منصب کو اپنائیں جو تماشے کو زندگی اور موت کا مسئلہ نہیں بناتا بلکہ ہمیشہ اسے ذرا فاصلے ہی سے دیکھتا ہے۔

بارہواں کھلاڑی ایک ایسا ہی سچا صوفی ہے۔ وہ بیک وقت اپنی ٹیم سے منسلک بھی ہے اور جُدا بھی۔ وہ میدان میں پہلی کے چاند کی طرح آتا ہے جو دوسرے ہی لمحے رُخصت بھی ہو جاتا ہے۔ وہ کرکٹ کے کھیل کا نباض، مفسّر، کارکن اور جاسوس ہونے کے باوجود اپنے دامن کو تر نہیں ہونے دیتا۔ ہونٹوں پر ایک عارفانہ

مسکراہٹ سجائے وہ قلبِ مطمئنہ کا مظاہرہ کرتا ہے۔ وہ مُتسلسل کی طرح سرپٹ دوڑنے کا قائل نہیں بلکہ مردِ زماں کی طرح مسلسل حرکت کے باوجود ٹھہراؤ کے ایک مستقل عالم میں دکھائی دیتا ہے۔ وہ میچ کو دیکھتا ہے، اونگھتا ہے اور خوش رہتا ہے۔

میں نے ٹیلی وژن کی طرف نظریں اُٹھائیں جہاں ایک ہی لمحہ پیشتر ہماری ٹیم کے ایک خوش شکل کھلاڑی سے تیسری بار کیچ چھُوٹا تھا اور پھر مجمع کی طرف دیکھا جیسے گویا سانپ سونگھ گیا تھا اور تب اپنے دوست پر ایک نظر ڈالی جس کا چہرہ ہلدی ہوگیا تھا۔ میں مُسکرایا۔ وہی عارفانہ مسکراہٹ جو صوفی کا واحد اثاثہ ہے اور پھر میں نے چُپکے سے بارہویں کھلاڑی کی سفید براق صَرف سے دھوئی ہوئی وردی پہنی اور بڑے اطمینان سے پلنگ پر دراز ہوکر مونگ پھلی کھانے لگا۔

حُقّہ پینا

میں خود حُقّہ نہیں پیتا لیکن اگر میرے سامنے کوئی خوش بخت حُقّے سے رومان لڑا رہا ہو تو سو جان سے اُس پر فدا ہو جاتا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ اُس پر بلا وجہ اعتبار بھی کرنے لگتا ہوں کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ وہ سگریٹ نوش کی طرح سیمابی اخلاقیات کا نہیں بلکہ دیرپا انسانی قدروں کا حامل ہوگا۔ کسی بھی شخص کے بارے میں اگر میرے رویّے میں تبدیلی لانا مقصود ہو تو آپ اس کی مخروطی انگلیوں سے سگریٹ نکال کر ان میں حُقّے کی نَے پھنسا دیں اور پھر دیکھ لیں کہ میری کرخت آواز میں ہلکی بارش کی جھنکار اور میری دُھلی ہوئی آنکھوں میں شبنم کی طراوت از خود پیدا ہو جائے گی۔ پچھلے دِنوں میرے رویّے کی اس انقلابی تبدیلی کا ایک عملی نمونہ میرے چند احباب کے سامنے آیا تو وہ عش عش کر اُٹھے۔ ہوا یوں کہ ہم لوگ کار میں گجرات سے سرگودھا کی طرف آ رہے تھے اور سیاست کی کسی تازہ کروٹ پر بحث کرتے ہوئے اس قدر غضب ناک ہو گئے تھے کہ ہماری زبانوں میں لُکنت اور آنکھوں سے وحشت برسنے لگی تھی۔ اور قریب تھا کہ ہم ایک دوسرے کی خوبصورت ٹائیوں پر جھپٹ پڑیں کہ ہم میں سے ایک صاحب نے تقریباً چیخ کر ڈرائیور سے کہا کہ وہ کار روک لے۔ پھر جب کار رُک گئی تو وہ انتہائی

سراسیمگی کے عالم میں کار کا دروازہ کھول کر باہر کی طرف لپکے اور سڑک پار کر گئے ان کے چہرے کے کساؤ اور ٹانگوں کی لڑکھڑاہٹ سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ قریب ترین جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو جائیں گے۔ لیکن نا صاحب وہ تو سیدھے کھیت کی منڈھ پر پہنچے جہاں دو دیہاتی ایک غلیظ سا حقہ لئے بیٹھے تھے اور پھر ان دیہاتیوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال کر وہیں پتلون ٹائی سمیت فرش خاک پر بیٹھ گئے اور حقے کے لذیذ کش لے لے کر دزدیدہ نگاہوں سے ہمیں دیکھنے لگے۔ یکایک مجھے یوں لگا جیسے میرا ان سے کبھی کوئی تنازعہ ہوا ہی نہیں تھا۔ چنانچہ میری آنکھوں کا سارا غبار بھک سے اڑ گیا، ہونٹ کھٹ سے مقفل ہو گئے، بھینچی ہوئی مٹھیاں چٹخ کر کھل گئیں اور میں نے بڑے پیار اور اعتماد سے ان پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اپنے پپوٹے میچ لئے اور مجھ پر ایک گہرا دبیز سا سکوت چھا گیا۔ میں نے سوچا کہ جو شخص حقے کی طلب پوری کرنے کے لئے ایک دھواں اگلتی بحث کو ختم اور تیز رفتار گاڑی کو روک سکتا ہے وہ زندگی کے معاملات میں کسی مریضانہ سنجیدگی کا اظہار بھلا کیوں کرنے لگا؟ بس اسی لمحے ان صاحب کے بارے میں میرا سارا رویہ تبدیل ہو گیا۔ چنانچہ جب وہ پندرہ منٹ کے بعد واپس آئے اور بحث کے سرے کو دوبارہ پکڑ کر مجھ سے الجھنے کی کوشش فرمانے لگے تو میں نے ان کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بصد لجاجت فقط اتنا کہا کہ میں سیاسی معاملات میں بالکل کورا ہوں بلکہ آج تک محض جھک مارتا آیا ہوں اس لئے اپنے سیاسی مؤقف سے دست بردار ہوتے ہوئے غیر مشروط طور پر اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں۔ میرے یہ الفاظ سن کر وہ صاحب مجھ سے اس لئے خفا ہو گئے کہ میں شاید ان سے مذاق کر رہا تھا جبکہ

واقعہ صرف یہ تھا کہ ان کی حُقّہ نوشی کے عملی مظاہرے نے میری ساری قوّتِ مدافعت سلب کرلی تھی اور میں نے ان کی شخصی اور سماجی برتری کو بلا چُون وچرا تسلیم کرلیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ حُقّہ پینا ایک اِتنا بڑا تہذیبی عمل ہے کہ اس کے آگے جُملہ تہذیبی خرافات گرد ہوکر رہ جاتی ہیں۔ ہمارے بزرگوں کو حُقّہ پینے کے اِس خاص پہلو کا نہایت گہرا احساس تھا۔ جبھی تو انہوں نے دوسری جماعت کی اُردو کی کتاب میں ماں کو بچّے سے پیار کرتے اور باپ کو حُقّہ سے لَو لگاتے ہوئے دِکھایا اور یُوں حُقّہ پینے کے عمل کو تقدّس کے دائرے میں کھینچ لائے۔ بعد ازاں جب تمباکو نوشی کو معاشرے کی صحت کے لئے مُضر قرار دینے کا رجحان پیدا ہوا تو ہمارے ماہرینِ تعلیم نے حُقّہ پینے کے عمل کی جگہ کھانا کھانے کے عمل کو دے دی اور یوں اپنے تئیں ایک سماجی خدمت سرانجام دینے میں کامیاب ہو گئے۔ حالانکہ "یہ خدمت" کسی صورت بھی قابلِ تعریف نہیں تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ حُقّہ پینا ایک قطعاً بے ضرر سا عمل ہے۔ جب آپ حُقّے کی نَے کو منہ میں لے کر سانس کو اندر کی طرف کھینچتے ہیں تو فقط چُٹکی بھر دھواں ہی اندر جاتا ہے جسے آپ دوسرے ہی لمحے مُنہ اور نتھنوں کے ذریعے خارج کر دیتے ہیں۔ ایسا بے مصرف عمل ذہنی کرب کا نہیں بلکہ روحانی طمانیت کا ذریعہ ہے جو کھانا کھانے یا نوالہ چبانے کے عمل میں ناپید ہے یوں بھی کھانا کھاتے ہوئے آپ دانتوں کی مدد سے ایک جارحانہ عمل کے مرتکب ہوتے ہیں۔ پہلے آپ روٹی کو پُرزے پُرزے کرتے ہیں۔ پھر گوشت کو بوٹی بوٹی اور اس کے بعد ان دونوں کو باہم ملا کر اپنے ناخنوں کی مدد سے منہ میں ٹھونستے ہیں جہاں خوفناک اور تیز بھالوں ایسے اصلی یا مصنوعی دانت ان پر بھوکے گِدھوں کی طرح جھپٹ

پڑتے ہیں، پھر کاٹنے، بھنبھوڑنے اور پیسنے کے وحشت ناک عمل کا آغاز ہو جاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے منہ میں آیا ہوا لقمۂ تر ایک غلیظ سے ملغوبے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اگر کھانا نوش کرتے ہوئے شخص کے منہ میں کسی طرح رنگین ٹیلیوژن کیمرہ مع ایک عدد خوش پوشاک اناؤنسر فٹ کر دیا جائے تو پھر آپ کو دانتوں کے جارحانہ عمل کا شائد کچھ اندازہ ہو سکے۔ دوسری طرف حُقہ پینے والے شخص کے منہ میں کچھ بھی تو نہیں ہوتا صرف ہونٹ لحظہ بھر کے لئے بند ہوتے ہیں اور سانس اندر کی طرف کھنچتا ہے۔ مگر پھر فوراً ہی کھانسی کا دورہ پڑتا ہے، آنکھوں میں پانی اُتر آتا ہے اور جو چٹکی بھر دھواں اندر گیا تھا، خفّت کے غبار میں لپٹا نتھنوں کے دُود کش میں سے گزر کر واپس آ جاتا ہے اس سارے عمل میں کوئی حیوانیت یا جارحیت نام کو نہیں ہوتی بلکہ یہ تو جارحیت کو سُلاتا اور انسان کو تہذیب کی دوڑ میں آگے کو لے جاتا ہے اور اب تو میں کئی بار یہ سوچتا ہوں کہ آج کے زمانے میں لُوٹ کھسوٹ، تکّا بوٹی اور خشکم پُری کی جو روایت جنم لے چکی ہے وہ محض اس وجہ سے ہے کہ کسی حُقّہ دشمن ماہرِ تعلیم نے قلم کی ایک ہی جنبش سے حُقّے کے لفظ کو دوسری جماعت کی اُردو کی کتاب سے خارج کر کے اس کی جگہ کھانا کھانے کے مکروہ الفاظ لکھ دیئے تھے۔

خدارا یہ نہ سوچیئے کہ میں تمباکو نوشی کا پرچار کر رہا ہوں۔ تمباکو سے تو مجھے اُسی روز نفرت پیدا ہو گئی تھی جب میں نے پہلی بار ریل میں سفر کرتے ہوئے تمباکو نوشی کے بارے میں ریلوے حکّام کا یہ اہانت آمیز اعلان پڑھا تھا کہ "جو شخص بغیر رضامندی اپنے ہمرائیوں کے تمباکو پیئے گا وہ جرمانے کی سزا کا مستوجب ہو گا جو" وغیرہ اور میں سوچنے لگا تھا کہ لعنت ہے ایسے فعل پر جس سے آپ کے ہم سفر کی طبیعت کے

اُلٹ جانے کا خطرہ ہو یا جس سے خلقِ خدا کی دلآزاری کا کوئی پہلو نکلے۔ مگر اب سوچتا ہوں تو مجھے یہ اعلان کچھ ذومعنی سا نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں تمباکو نوشی کی مذمت نہیں کی گئی بلکہ صرف ہم سفر کی رضامندی حاصل نہ کرنے کے عمل کو قابلِ نفرت قرار دیا گیا ہے جس کا مطلب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ اگر آپ کسی طرح اپنی تمباکو نوشی میں کمپارٹمنٹ کے سارے شرفاء کو شامل کر لیں تو ٹھیک ہے اور اگر آپ محض کھڑکی سے منہ نکال کر اس کارِ خیر کے مزے لوٹنا چاہیں تو آپ کی خیر نہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس اعلان سے سگریٹ نوشی کی مذمت اور حُقّہ نوشی کی حمایت کا پہلو نکلتا ہے جو ہر اعتبار سے قابلِ تعریف ہے وہ یوں کہ جب آپ سگریٹ سُلگا کر اس کے نیلے پیلے مرغولوں کے جال میں محبوس ہو جاتے ہیں تو آپ کے اور کمپارٹمنٹ میں سفر کرنے والے مسافروں کے درمیان غیریت کا ایک پردہ سا آویزاں ہو جاتا ہے جو اشتراک اور بھائی چارے کے بین الاقوامی مؤقف کی صریحاً خلاف ورزی ہے جب کہ حُقّہ کا شغل اختیار کرتے ہی آپ کو محسوس ہوتا ہے جیسے چاروں طرف سے نیم وا آنکھیں آپ کو پیار سے گھورنے لگی ہیں اور جسموں میں بے وجہ سی کسمساہٹ ہونے لگی ہے۔ معاً کوئی جانِ ناتواں آپ کی طرف آہستہ آہستہ کھسکتی ہے، حتیٰ کہ حُقّے کی نَے اُس کے منہ کی زد میں آجاتی ہے اور پھر آپ دیکھتے ہیں کہ کمپارٹمنٹ کے سارے غنچہ دہن آپ کے گرد ایک دائرے کی صورت میں جمع ہو گئے ہیں اور آپ کا ہاتھ جس نے حُقّے کو تھام رکھا تھا بڑے پُراسرار مشینی انداز میں حُقّے کی نَے کو گھمانے لگا ہے اور نَے بے چاری ایک غار سے نکلنے اور دوسرے میں گھُسنے کے طویل عمل کے بعد بار بار آپ کے دہنِ مبارک میں پہنچ رہی ہے۔ تب آپ کو

محسوس ہوتا ہے جیسے آپ نے دُنیا جہان کے انسانوں سے رابطہ اور بھائی چارہ پیدا کر لیا ہے۔ حُقّہ مجتمع کرتا ہے، مفاہمت اور محبت کو جنم دیتا ہے، ایک دوسرے کے دُکھ درد کو سمجھنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ اکلاپے کے کرب ناک احساس سے نجات دلاتا ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ نفرت کی دیواروں کو مسمار کرتا ہے مثلاً جب حُقّے کی نَے آپ کے قریب ترین بیٹھے ہوئے کرم فرما کے سیاہ متعفن اور موٹے ہونٹوں کو چھُو کر آپ کی طرف لوٹتی ہے اور آپ اسے ڈیٹول سے دھوئے بغیر اس پر اپنے نازک ہونٹ ثبت کر دیتے ہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپ نے اس ایک تابندہ لمحے میں اپنے جُملہ قبائلی، نسلی، خاندانی اور جماعتی تعصبات کو ختم کر کے انسانی اخوّت اور عالمی برادری کے احساس کو پروان چڑھا دیا ہے۔ دوسری طرف سگریٹ نوشی ایک قطعاً بورژوا عمل ہے جو آپ کو مردم بیزاری کی طرف راغب کرنے کے علاوہ ایک ذہنی قلعے میں محبوس کر دیتا ہے۔ سگریٹ تو ایک غلط قسم کے احساسِ برتری کو جنم دیتا ہے اور سگریٹ پینے والا انبوہ سے کٹ کر کسی یکہ و تنہا جزیرے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ سگریٹ پینا اپنی انفرادیت بلکہ اَنا کا اظہار کرنا ہے جو فی زمانہ ایک قطعاً غیر مستحسن فعل ہے۔ میں نے آج تک کسی سگریٹ نوش کو اپنے منہ سے آدھا پیا ہوا سگریٹ نکال کر کسی دوسرے سگریٹ نوش کے منہ میں ٹھونستے ہوئے نہیں دیکھا اور نہ دوسرا سگریٹ نوش اس حرکت کو بنظرِ استحسان ہی دیکھتا ہے۔ اُس کی تیز نظریں تو سدا اُس بگلا پیٹ پر جمی رہتی ہیں جس میں سگریٹ پینے والے نے فجی طور پر کیپسٹن کے سگریٹ چھپائے ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ سراغ رسانی کی آبائی جبلّت کے تحت اس بات کی کوشش

کرتا ہے کہ اس تاریخی پیکیٹ کے مندرجات کی نقاب کشائی کرے اور پھر ان میں سے کوئی سگریٹ اُچک کر اس سے بلا شرکتِ غیرے لطف اندوز ہو۔ حُقہ دائرہ بناتا ہے اور دائرے کے اندر ہی رواں دَواں رہتا ہے جب کہ سگریٹ خطِ مستقیم بناتا ہے اور پھر اپنے ہم زاد کو ساتھ لئے دُوریوں میں کھو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو حُقہ پینا ایک سماجی عمل ہے جب کہ سگریٹ پینا سماج سے انحراف کی طرف پہلا قدم! چنانچہ اسی لئے میں حُقہ نوش کو سگریٹ نوش کے مقابلے میں کہیں زیادہ منجھی ہوئی اور مہذب شخصیت قرار دیتا ہوں۔

سگریٹ ایک ایسی جنس ہے جسے زیادہ سے زیادہ اکہری شخصیت کا حامل قرار دیا جا سکتا ہے جب کہ حُقہ دوہری بلکہ تہری شخصیت کا علم بردار ہے۔ مثال کے طور پر مہنگے سے مہنگے سگریٹ کے اجزائے ترکیبی میں بھی آپ کو تمباکو اور کاغذ کے علاوہ کچھ اور دکھائی نہیں دے گا۔ بہت ہوا تو کاغذ کی کوالٹی بدل گئی یا کسی من چلے نے اس کے ساتھ ننھا سا فلٹر جوڑ دیا اور بس! مگر حُقہ سگریٹ کی اس سادگی پر ہمیشہ سے خندہ زن رہا ہے۔ وجہ یہ کہ وہ بجائے خود ایک ایسی پیچیدہ مشین ہے جو نہ صرف متعدد پرزوں سے مِل کر مرتب ہوئی ہے بلکہ کام بھی سائنسی اصولوں کے تحت ہی کرتی ہے۔ حُقہ کا وہ نچلا حصہ جسے ریڈی ایٹر کا نام ملنا چاہیئے پانی سے لبالب بھرا ہوتا ہے اور کائنات کے اُن ابتدائی ایام کی یادگار ہے جب چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ اسے حُقے کا "اجتماعی لاشعور" بھی کہا جا سکتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس "اجتماعی لاشعور" میں ایک نالی زمانے کی طرف سے آکر گرتی ہے اور چلم میں پیدا ہونے والے دھوئیں کو پانی سے ہم آہنگ کرنے کا اہتمام کرتی ہے۔

جب کہ دوسری نالی اس اجتماعی لاشعور سے شعور کی طرف جاتی ہے اور دھوئیں کو حُقّہ نوش کے حلق تک پہنچا دیتی ہے۔ حُقّے کی اس پیچیدہ مشین کا ہر پرزہ جس جگہ بھی ہے آفتاب کا درجہ رکھتا ہے اور اسی لیئے قدیم زمانے ہی سے ان پُرزوں کو الگ الگ ناموں سے نوازا گیا ہے۔ مثلاً حُقّے کے پانی کی ٹینکی کو "حُقّہ" کا نام مِلا ہے۔ کوئلے یا آگ کی بھٹّی کو چلم کہہ کر پکارا گیا ہے۔ تمباکو کے نیچے رکھی ہوئی نمک کی ڈلی کو روڑ اور پانی کی طرف جانے والی نالی کو آبنا کہا گیا ہے۔ اسی طرح حُقّہ نوش کے منہ کی طرف آنے والی نالی نَے یا نگالی کہلائی ہے۔ یہ نَے حُقّہ نوش کے کردار کی مناسبت سے کبھی نیزے کی طرح سیدھی ہوتی ہے، کبھی آداب عرض کے سے انداز میں خم دار اور کبھی زہریلے سانپ کی طرح سر سے پاؤں تک کُنڈلی مارے ہوئے! — وہ چھوٹا سا پُرزہ جو نَے اور نالی کے درمیان پُل کا کام دیتا ہے "ضامن" کہلاتا ہے۔ پھر جس طرح ہر آزاد کے ساتھ ایک خرجی بھی ہمیشہ سے منسلک رہا ہے بالکل اسی طرح ہر دھواں اُگلتی چلم کے ساتھ ایک چھوٹا سا بالشتیہ چمٹا یا دست پناہ بھی چمٹا ہوتا ہے۔ گویا جہاں سگریٹ کے اجزاء ترکیبی میں بجز افلاس اور کچھ نہیں ملتا وہاں حُقّے کے حصّے متنوّع اور رنگا رنگ ہیں۔ اسی لیئے میں نے سگریٹ کے مقابلے میں حُقّے کو ہمیشہ دوہری تہری شخصیت کا حامل قرار دیا ہے۔

حُقّہ پینا تہذیبی اعتبار ہی سے نہیں ثقافت کی رُو سے بھی ایک مستحسن فعل ہے ثقافت کا لُبِّ لباب یہ ہے کہ رسوم (RITUALS) کے ذریعہ اپنے ماضی سے پوری طرح منسلک ہوا جائے تاکہ قدیم ترین سرچشموں سے نکلنے والا امرت دھارا بغیر رُکے آپ کی شریانوں تک پہنچ جائے۔ میں اُس دھرتی کو ثقافتی اعتبار سے زوال آمادہ قرار دیتا ہوں جس میں تہوار منانے کا التزام باقی نہیں رہتا اور تجریدیت اس قدر

توانا ہو جاتی ہے کہ انسان بالا بالا ہی اُڑ جاتا ہے۔ سگریٹ پینا ثقافت کی رُو سے ایک بے ثمر عمل ہے کیوں کہ یہ انسان کو ہوا میں تحلیل کر دیتا ہے۔ جب کوئی سگریٹ سلگاتا ہے تو سگریٹ کے مرغولوں کے ساتھ ساتھ تخیلات کی ایک دُنیا بھی آباد کر لیتا ہے اور پھر ان تخیلات میں یوں کھو جاتا ہے کہ اُسے گرد و پیش کا ہوش تک نہیں رہتا سگریٹ تو ہائیڈروجن گیس سے بھرا ہوا وہ غبارہ ہے جو انسان کو آسمان کی طرف اُڑا لے جاتا ہے اور زمین اُس کے پاؤں تلے سے نکل جاتی ہے جب کہ حُقّہ اسے زمین کی سوندھی سوندھی باس سے آشنا کرتا ہے اور زندگی پر اُس کی گرفت مضبوط ہو جاتی ہے۔ رسوم سے لُطف اندوز ہونے کے اعتبار سے بھی سگریٹ پینا ایک قطعاً سپاٹ سا عمل ہے۔ آپ اپنی جیب کو ذرا سا تھپتھپا کر سگریٹ کا پیکٹ نکالتے ہیں، پھر اس میں سے ایک سگریٹ انتخاب کر کے اسے ماچس کی تیلی یا لائٹر سے جلاتے ہیں اور سگریٹ سلگانے کا عمل اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کو کوئی ایسا اہتمام کرنا نہیں پڑتا جو سگریٹ پینے کے عمل میں ثقافتی گہرائی پیدا کر سکے دوسری طرف حُقّے کی تیاری بجائے خود طویل ترین جاندار رسموں کا ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ مثلاً پہلے تو کئی روز تک حُقّے کے لئے تمباکو تیار کیا جاتا ہے۔ کتنے سیر تمباکو میں کتنی چھٹانک گُڑ کا شیرہ ڈالا جائے پھر اس کو کس قدر ملایا سکھایا جائے وغیرہ۔ یہ مسائل اضطراری طور پر حل نہیں ہوتے۔ انہیں حل کرنے کے لئے جو ذہنی قوت درکار ہے وہ حقیقتاً ایک ایسے ثقافتی ورثے کی حیثیت رکھتی ہے جو نسل در نسل منتقل ہوتا ہوا ہم تک پہنچا ہے۔ تمباکو تیار ہو گیا تو پھر حُقّے کی تیاری شروع ہوتی ہے۔ مان لیا کہ حُقّہ نوش پہلے ہی اپنے ذوق نظر کے مطابق حُقّہ خرید چکا ہے یا اپنے آبائی حُقّے کو

اپنی تحویل میں لا چکا ہے لیکن ہر بار جب وہ حُقّے کو تازہ کرتا ہے تو صدیوں پرانے اُس (RITUAL) ہی سے گزرتا ہے جو پانی کے ذریعے طہارت کا اہتمام کرتا آیا ہے۔ مراد یہ کہ حُقّہ پینے والا حقّے کو گنگا اشنان ایسے عمل سے پوتر کرتا ہے اور پوتر کرتے ہوئے کچھ منتر بھی اُگلتا جاتا ہے۔ پھر جب حُقّہ تیار ہو گیا تو چلم کی تیاری کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ چلم میں ایک نہایت، خوبصورت نمک کا چھوٹا سا گنبد موجود ہونا چاہیے جو حُقّے کے عناصر یعنی آگ اور پانی کے درمیان کسی جنگی مبصر کا کام دے تاکہ ان کا آپس میں تصادم نہ ہونے پائے۔ چلیے نمک کی ڈلی کا معاملہ بھی طے ہو گیا تو اب چلم میں آگ سجانے کا مرحلہ ہے۔ حُقّہ پینے والے خوب جانتے ہیں کہ حُقّہ تیار کرنے کے عمل میں یہی نازک ترین مرحلہ ہے کیوں کہ آگ کی نوعیت حُقّے کے مزاج پر براہِ راست اثر انداز ہوتی ہے۔ اگر حُقّہ پینے والا چلم میں اُپلے کی آگ رکھے گا تو حُقّے کے کش میں بھینس کے دودھ کی حلاوت از خود پیدا ہو جائے گی۔ اگر وہ لکڑی کے کوئلے سجائے گا تو اُس درخت کی نسبت سے جس کی لکڑی استعمال ہوئی ہے حُقّے کے کش میں بھی ایک خاص قسم کی کڑواہٹ یا تیزابیت محسوس ہو گی۔ پھر کوئلے کا حجم بجائے خود حُقّے کے مزاج پر اثر انداز ہو گا مثلاً اگر کوئی اناڑی ہے اور چلم میں چھوٹے بڑے بھانت بھانت کے کوئلے جمع کر کے کش لگاتا ہے تو اسے اس کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہنا چاہیے لیکن اگر اُس کا سو پُشت سے پیشۂ آبا حُقّہ نوشی ہے تو پھر ظاہر ہے کہ وہ چلم میں ننھے ننھے ایک ہی سائز اور وضع کے کوئلے اس خوبی سے سجائے گا جیسے ہار میں موتی پرو رہا ہو اور اس کا نتیجہ بھی نہایت خوشگوار نکلے گا۔ مگر حُقّے کی تیاری کے جملہ مراحل محض چلم کی تیاری پر ختم نہیں ہو جاتے۔ حُقّے کے پانی کو ایک خاص مقدار سے کم یا زیادہ

نہ ہونے دینا بھی تو ایک مسئلہ ہے جسے ایک طویل ریاضت کے بغیر سرانجام دینا مشکل ہے۔ چنانچہ ایک منجھا ہوا حُقہ نوش اس سلسلے میں جس مہارت کا ثبوت دیتا ہے وہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ وہ نَے کو منہ میں رکھ کر ایک زوردار پھونک مارتا ہے جس سے حُقّے کا ناضل پانی ایک شفاف چشمے کی طرح اُبل کر باہر گر جاتا ہے۔ پھر وہ ایک زوردار کش لیتا ہے لیکن نہ اس قدر کہ حُقّے کا پانی اس کے حلق سے گذر کر پیٹ میں پہنچ جائے اور پھر پیٹ کے سارے سرمائے کو ساتھ لے کر واپس آجائے۔ اس عمل کو دو تین بار دہرانے سے حُقّے کے مزاج میں اعتدال کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ آپ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزار سکے بلکہ میں تو یہ تک کہوں گا کہ جس طرح ایک موسیقار پہلے اپنے ساز کی لَے اور آہنگ کو درست کرتا ہے اور پھر کوئی نغمہ چھیڑتا ہے بالکل اسی طرح ایک فن کار حُقّہ نوش حُقّہ سے پانی خارج کرنے کے عمل میں حُقّے کی گڑگڑاہٹ کو ایک خاص صوتی مقام پر لاکر گویا قائم کر دیتا ہے اور اس کے بعد اس پر انگاروں بھری ٹوپی سجا کر حُقّہ نوشی کا عملی مظاہرہ کرتا ہے۔ بعض عاشقانِ حُقّہ اپنی کارروائی کو حُقّے اور چلم کے تیار ہو جانے پر بھی ختم نہیں کرتے بلکہ اس کے بعد حُقّے کی دونوں شاخوں کے عین درمیان گلاب اور موتیے کے ہار لٹکا دیتے ہیں۔ یوں کہ دُور سے دیکھنے والے کو محسوس ہوتا ہے جیسے وہ حُقّہ نہیں پی رہے، کسی پھولوں بھری ڈالی کو چبا رہے ہیں۔

حُقّہ پینے سے پہلے کا یہ سارا اہتمام، حُقّہ نوشی کے عمل میں گہرائی پیدا کرتا ہے اور انسان کو بڑے بڑے حقہ نوشوں کی رُوحوں سے براہِ راست ہم کلام ہونے کے سنہری مواقع فراہم کرتا ہے۔ بھلا یہ بات رُوکھے سُوکھے کاغذی پیرہن میں لپٹے ہوئے تصویری پیکروں یعنی سگریٹوں کے نصیب میں کہاں؟

مُعافی مانگنا

معاف کرنا ایک شعوری فعل ہے مگر معافی مانگنا ایک فطری عمل ہے۔ معاف کرنے والا ہونٹوں کے معنی خیز تبسم یا ابرو کے ہلکے سے اشارے سے معاف کر دینے کا قائل نہیں۔ وہ تو اس بات کا قائل ہے کہ ڈھول تاشوں کے ساتھ سٹیج پر آئے اور وہاں قمیض اتار کر پہلے تو ان چرکوں کی نمائش کرے جو فریقِ مخالف نے اس کے بدن اور رُوح پر لگائے تھے اور پھر ببانگِ دہل اس بات کا اعلان کرے کہ ہر چند فریقِ مخالف کے مظالم انگنت اور ناقابلِ معافی ہیں لیکن میرے دِل کی کشادگی دیکھو کہ معاف کر رہا ہوں۔ کتنا عظیم ہوں میں معاف کرنے میں زیاں اور احساسِ زیاں کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ اُلٹا اس بات کا احتمال ہے کہ عزیز رشتہ دار، دوست احباب، اپنے پرائے سب آپ کے شانوں کو تھپک کر شاباش دیں گے کہ آپ نے عالی ظرفی کا ثبوت دیا، بزرگوں کی روایت کو آگے بڑھایا، محبت، اخوت اور بھائی چارے کا سنگِ بنیاد رکھا، سماجی اور اخلاقی قدروں کو تقویت دی اور یوں جریدۂ عالم پر آپ کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ثبت ہوا۔ مگر کیا واقعی ؟

کیوں کہ میرا یہ خیال ہے کہ معاف کرنا رعونت اور خود پسندی کی ایک مثال فراہم

کرنا ہے۔ مجھے معاف کرنے والے کے سَر پُر غرور سے نفرت ہے۔ میں معاف کرنے والے کو کبھی معاف نہیں کر سکتا کیوں کہ وہ معافی دینے کے بعد ایک ایسی مخلوق بن جاتا ہے جو زمین پر رہنے کے بجائے ہمالیہ یا اولمپس کی بلندیوں پر رہنا پسند کرتی ہے۔ وہ خود کو آدمی کی سطح سے اُوپر اُٹھا کر دیوتا کی سطح پر لے آتی ہے یا کم از کم اس وہم میں مبتلا ہو جاتی ہے کہ وہ کوئی غیر ارضی مخلوق ہے۔ معاف کرنے والا اپنے اور اپنے مدِ مقابل کے درمیان ایک کشادہ خلیج پیدا کرتا ہے۔ وہ خلقِ خدا کو دو واضح جماعتوں میں تقسیم کر کے خوش ہوتا ہے۔ ایک وہ جماعت جو معاف کرنے کے جملہ آداب سے واقف ہے، دوسری وہ جو معافی مانگنے کے ہُنر سے بہرہ ور ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے جیسے وہ کوئی برہمن ہے جس کے قدموں میں گرا ہوا شودر اُس سے اپنی ہزاروں نسلوں کی ناعاقبت اندیشیوں کی معافی مانگ رہا ہو اور وہ خود اُسے رحم کی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہے، غلیظ، ملیچھ، جنور! جا تجھے معاف کیا۔ ورنہ تُو کہ انسانیت کے چہرے پر ایک بدنما دھبّہ ہے، تجھے کیسے معاف کیا جا سکتا ہے!

مگر میں کہتا ہوں کہ معاف کرنے والا تو تہذیبی اعتبار سے ایک قطعاً ناتراشیدہ کردار ہے کیوں کہ دشمن کی کھال اُدھیڑ کر قہقہہ لگانے اور دشمن کو ہنس کر معاف کر دینے میں مزاجاً کوئی خاص فرق نہیں۔ دونوں احساسِ برتری کے مظاہرے ہیں۔ دونوں صورتوں میں شخصِ مذکور دشمن کو بنظرِ تحقیر دیکھتا اور اپنی کارکردگی پہ نازاں ہوتا ہے۔ سو معاف کرنے والا بھی درحقیقت اندر سے وہی نیم وحشی انسان ہے جو دوسروں کی شکست میں اپنی اَنا اور شخصیت کی فتح دیکھتا ہے۔ دوسری طرف معافی مانگنے والا ایک ایسا دیدہ ور ہے جو کہیں ہزاروں برس کی تہذیبی بے نُوری کے بعد جنم لیتا ہے۔

معافی مانگنے میں اپنی شخصیت کی نفی کرنے کا وصفِ خاص پنہاں ہے جو طویل ریاضت کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔ معافی کا طالب اپنی شخصیت کے ذرہ بکتر کو جسم سے الگ کر کے اپنے فطری حسن کی نمائش کرتا ہے اور تہذیب کے سلاسل سے آزاد ہو کر واپس فطرت کی گرم و گداز آغوش میں چلا جاتا ہے۔ غور کیجئے کیا زندگی کی ہموار سطح پر شخصیت ایک پھوڑے کی طرح نہیں ہے؟ - جب خون کی ساری غلاظت ایک جگہ جمع ہو جاتی ہے تو جسم پر اُبھار سا نمودار ہو جاتا ہے۔ جب انا پھولتی اور تکبر پھلتا ہے اور ہمچو ما دیگرے نیست کا احساس انسان کے سر پر بھاری عمامہ اور جسم پر لباسِ فاخرہ بن جاتا ہے تو شخصیت بھی انسانیت کے بدن پر ایک پھوڑے کی طرح نظر آنے لگتی ہے۔ پھر جب شخصیت کے پھوڑے کو زمانے کا نشتر چھیڑتا ہے تو گلتے ہوئے ناسور سے بہتی ہوئی پیپ سارے ماحول کو متعفن کرنے لگتی ہے مگر معافی مانگنے والے شخص کے خون میں کوئی ایسا اینٹی باڈی اوٹمک پیدا ہو جاتا ہے جو اندر ہی سے پھوڑے کے سارے مواد کو خشک کر دیتا ہے لہٰذا نشتر کی ضرورت ہی نہیں پڑتی اور سارا بدن شیشے کی طرح ہموار اور شفاف ہو جاتا ہے۔ تاریخ اُن جابر سلاطین کا نام تو بھول گئی جو زندگی بھر ہر چھوٹی بڑی سلطنت کو تہِ تیغ کرنے کے ضروری کام پر مامور رہے مگر ان بادشاہوں کو نہ بھلا سکی جنہوں نے اپنی شخصیت کو انا کا مسئلہ نہ بنایا بلکہ قاعدے کے مطابق دانتوں میں تنکے دبانے فاتح کے حضور پہنچے اور اپنی شخصیت کو منہدم کر کے فاتح کو ذلیل و رسوا کر گئے۔ سکندرِ اعظم ایسا فاتح معافی مانگتے ہوئے پورس کے سامنے محض ایک موہوم سا نقطہ بن کر رہ گیا اور اس کی ساری شخصیت قطعاً بے آب ہو کر رہ گئی۔ لوگ کہتے ہیں کہ بیاس کے کنارے پہنچ کر سکندر کی فوج نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ مگر کوئی نہیں جانتا کہ اس نے کیوں انکار کیا۔ اصل بات یہ ہے کہ پورس نے معافی مانگ کر سکندر کی ساری بھاری

بھرکم شخصیت کو تار تار کر دیا تھا اور اب اُس کے فوجی بھی اس کی قیادت کو تسلیم کرنے سے انکار کر رہے تھے۔

چند روز ہوئے میرے ایک دوست نے مجھے اپنے ایک بہت پرانے ملازم کا قصہ سُنایا۔ یہ ملازم اپنی حماقتوں سے خاصی توڑ پھوڑ کرتا رہتا تھا۔ ایک روز اُس نے کچھ زیادہ ہی تخریبی کارروائی کی تو میرے دوست نے انتہائی برہمی کی حالت میں اُسے ملازمت سے برطرف کرتے ہوئے حکم دیا کہ وہ فوراً کہیں چلا جائے مگر ملازم کی کئی نسلیں اس گھر کو تہ و بالا کرتی آئی تھیں، لہٰذا اُس نے نقلِ مکانی سے صاف انکار کر دیا۔ پھر جب نمک حلالی کے اس ثبوت پر بھی مالک کے غصّے کا پارہ نہ اُترا تو وہ میرے دوست کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر معافی کا خواستگار ہوا۔ میرے دوست نے معافی دینے سے انکار کیا مگر ملازم پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ اُس نے آنکھیں میچ لیں، ہاتھ جوڑ دیئے اور "معافی، معافی، معافی" کا ورد کرتا چلا گیا۔ میرا دوست کہتا ہے کہ اس کی یہ حالت دیکھ کر پہلے تو میرا غصّہ فرو ہوا، پھر میرے دل میں اس کے لئے ہمدردی پیدا ہوئی جو جلد ہی احساسِ ندامت میں تبدیل ہو گئی۔ پھر یوں ہوا کہ میری ساری شخصیت اندر سے ٹوٹ پھوٹ گئی اور مجھے محسوس ہوا جیسے میں اندر سے بالکل خالی ہو گیا ہوں۔ دوسری طرف ملازم کے چہرے پر ایک عجیب سا جلال تھا جو اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے بعد ہی نمودار ہوتا ہے۔ اُس کے اندر کوئی ایسی پُراسرار قوت پیدا ہو گئی تھی جس کا سامنا کرنا ہی مشکل تھا۔ میرا دوست کہتا ہے کہ مجھے اس شخص سے ڈر آنے لگا۔ جو شخص اپنی اَنا، اپنی پوری شخصیت اور وجود کی نفی کر دے، اُس کا مقابلہ کون کر سکتا ہے؟

آج صبح میں نے معافی مانگنے والے کی اس غیر مرئی قوت کا ذکر اپنے دوست م۔م سے کیا تو ان کی مرنجاں مرنج طبیعت جولانی پر آگئی۔ عینک اُتار کر اُس کے شیشے صاف کرتے ہوئے بولے،

"کبھی آپ نے رسّہ کشی کا منظر دیکھا ہے۔ ارے بھئی وہی "TUG OF WAR"

"ہاں جب میں کالج میں پڑھتا تھا تو ایک بار ۔"

کہنے لگے:

"ٹھیک ہے! اب سوچئے کہ دونوں طرف سے زور آزمائی ہو رہی ہے، سانس پھُول رہے ہیں اور پسینے چھُوٹ رہے ہیں اور پھر اچانک ایک طرف کے پہلوان نا کھلاڑی رسّے کو ڈھیلا چھوڑ دیتے ہیں۔ جانتے ہیں ایسے میں کیا ہوگا؟"

میں نے کہا:

"ہوگا کیا؟ یہی کہ دوسری طرف کے پہلوان چاروں شانے چِت ایک دوسرے پر جا گریں گے۔"

کہا:

"بس یہی حالت اس شخص کی ہوتی ہے جس کا مدِ مقابل اچانک معافی مانگ لے۔ وہ شخص تو سمجھو تباہ ہو گیا، برباد ہو گیا، چاروں شانے چِت ہو گیا کیوں کہ اُس نے فریقِ مخالف کا مقابلہ کرنے کے لئے جو قوت جسم کے سب حصّوں اور نسل کے سارے گوداموں سے ایک جگہ اکٹھی کی تھی اس کا تو مصرف ہی باقی نہ رہا۔ اب یہ قوت خود اس شخص کو تہِ تیغ نہیں کرے گی تو کیا کرے گی؟"

بات میری سمجھ میں آگئی۔ چنانچہ میں نے م۔م سے کہا کہ یہ تو پیر صاحب والی بات ہوئی کہ انہوں نے چلّہ کاٹ کر جن تو طلب کر لئے مگر جس شخص کو زک پہنچانے کے لئے انہیں بلایا گیا تھا وہ جنوں کا انتظار کئے بغیر ہی راہیٔ ملکِ عدم ہو گیا۔ اب ظاہر ہے کہ جن صاحبان پیر صاحب ہی پر اپنی قوت آزمائیں گے۔

ذہانت کے اس مظاہرے پر م۔م خوش ہوئے اور خوشی خوشی چلے گئے۔ مگر میں تا دیر سوچتا رہا کہ جن شاید معاف کرنے والے کی تحویل میں نہیں ہوتا بلکہ معافی مانگنے والے کی گرفت میں ہوتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ معافی مانگنے کے عمل ہی سے پیدا ہوتا ہے اور پھر معافی مانگنے والے کو تو کچھ نہیں کہتا۔ البتہ معاف کرنے والے کو ضرور تہِ تیغ کر دیتا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ جب کوئی شخص معافی کا طلب گار ہوتا ہے تو اپنی ذات کی کسی مخفی قوت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ شخصیت کی پتھریلی زمین میں سے ذات کے مخفی چشمے کو باہر نکلنے کا راستہ سجھاتا ہے۔ پھر وہ زندگی کے بدن پر پھوڑے کی طرح اُبھرا ہوا نہیں رہتا بلکہ لہو بن کر بدن کی رگوں میں دوڑنے لگتا ہے یا ہوا، پانی اور آگ ایسے عناصر میں ڈھل کر واپس فطرت کے بے نام جسم کا حصہ بن جاتا ہے۔ معافی مانگنے والا فطرت کا ایک حصّہ ہے بلکہ وہ تو خود فطرت ہے اور فطرت ہمہ وقت عفو و درگزر کی طالب ہوتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں نے ہمیشہ معافی مانگنے کے عمل کو معاف کرنے کے عمل پر فوقیت دی ہے کہ ایسا کرنے سے انسان حدود کو عبور کر کے لامحدود کے آستانے تک پہنچ جاتا ہے۔

لاہور

تا حال میں خود کو دیدۂ عبرت نگاہ کا ہدف بننے پر مائل نہیں کر سکا۔ حالانکہ میں جب سے اپنا گاؤں چھوڑ کر شہر لاہور میں قیام پذیر ہوا ہوں عبرت حاصل کرنے والوں نے مجھے بار بار تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ دراصل مجھے دیدۂ عبرت نگاہ کے کٹہرے میں کھڑا ہونے کی نہ آرزو ہے نہ فرصت! میں تو اپنی ہی ذات کے رُو برُو کھڑا ہونے اور خود ہی سے ہم کلام ہونے کی کوشش میں ہوں۔ گاؤں میں رہتے ہوئے مجھے صبح شام ہم کلامی کے ہزاروں مواقع حاصل ہوتے تھے مثلاً صبح جب سورج نکلتا اور گندم کے کھیتوں میں اوس کے کروڑوں نبک اندام قطرے یکایک دمک اُٹھتے تو مجھے ہر قطرے میں اپنی ہی شکل دکھائی دیتی اور یوں خود سے ملاقات کی صورت از خود پیدا ہو جاتی یا جب اندھیری رات میں آسمان کی سیج پر لاکھوں ستارے موتیے کے پھولوں کی طرح خوشبو بکھیرتے تو مجھے اس خوشبو میں اپنے ہی جسم کی باس کا گمان ہوتا اور یوں خود سے ہم کلام ہونے کی ایک اور صورت پیدا ہو جاتی مگر شہر میں آنے کے بعد مجھے یوں لگتا ہے جیسے زمانے نے ایک زقند بھری ہے اور میں مستقبل کی کسی مشینی فضا میں آگرا ہوں، اب مجھے شاذ ہی خود سے

ہم کلام ہونے کا موقع ملتا ہے۔ پچھلے دِنوں میں نے ایک شعر کہا ؏

سُنائی دیتی نہیں تھی مجھے مری آواز
تمہارے شہر میں رہنا عذاب ایسا تھا

اور یہ شعر میرے اکلاپے کے کرب کو اُجاگر کر گیا کہ اکلاپا اس وقت دُور نہیں ہوتا جب آپ دوسروں سے محوِ گفتگو ہوں۔ اکلاپا تو خود سے ہم کلام ہونے پر ہی زائل ہوتا ہے۔ انجمن تو ذات کے اندر ہے باہر نہیں۔ باہر تو عذاب کی وہ صورت ہے جسے سناٹے کے عفریت نے شدید تر کر رکھا ہے۔ صبح سویرے جب ملازم میرے سامنے ناشتے کی ٹرے رکھتا ہے تو ٹرے میں چائے کی پیالی اور ٹوسٹ کے جلے ہوئے ٹکڑوں کے ساتھ ایک کھڑکھڑ کرتا ہوا اخبار بھی لاتا ہے۔ میں ٹوسٹ زہر مار کرتا ہوں اور چائے کی مدد سے اس "جنسِ کثیف" کو جلدی جلدی اپنے معدے میں اُتارتا ہوں تاکہ اخبار پر جھپٹ سکوں۔ ایسا کیوں ہے؟ مجھے خود بھی معلوم نہیں۔ گاؤں میں صورت یہ تھی کہ کبھی کبھی تو ہفتہ بھر اخبار پڑھنے کا موقعہ نہ ملتا اور نہ خواہش ہی پیدا ہوتی۔ پھر جب شومئی قسمت سے کوئی اخبار دست بدست چلتا ہوا مجھ تک پہنچتا تو مجھے یہ جان کر یک گونہ اطمینان نصیب ہوتا کہ میری ہفتہ بھر کی بے اعتنائی کے باوجود دُنیا وہیں کی وہیں ہے جہاں میں نے اسے ایک ہفتہ قبل چھوڑا تھا مگر شہر میں آکر یہ صورت ہوئی ہے کہ مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے اگر میں نے صبح سویرے اخبار نہ پڑھا تو شاید شام تک اگر ساری دنیا نہیں تو کم از کم لاہور شہر ضرور دریا بُرد ہو جائے گا۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے سارے جہاں کا درد میرے ہی جگر میں ہے یا جیسے میں نے ہی سارے لاہور کو اپنے نحیف شانوں پر اُٹھا رکھا ہے۔

ہر صبح میں سورج کے ساتھ اپنے سفر کا آغاز کرتا ہوں اور جب سورج راوی کی بارہ دری کے پار کہیں غروب ہو جاتا ہے تو شہر کے بوجھ کو اپنے شانوں سے اتارے بغیر سو جاتا ہوں۔ مگر دوسری صبح اخبار کی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ ہی یہ پیرِ تسمہ پا جاگ اُٹھتا ہے اور میں پھر سے دِن کے زرد پہاڑ پر چڑھنے لگتا ہوں۔ مگر لاہور تو کچھ عرصہ ہی سے پیرِ تسمہ پا بنا ہے ورنہ صدیوں تک اس کی حیثیت ایک آکاس بیل کی سی رہی ہے۔ پیرِ تسمہ پا تو ایک بوجھ ہے جسے گردن پر لاد دیا جاتا ہے اور پھر چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے یہ بوجھ انسان کو زمیں بوس ہونے پر مجبور کیئے رکھتا ہے۔ دوسری طرف آکاس بیل کی طرف دیکھو۔ پیلی پیلی سوتیں ایسی یہ مخلوق سارے درخت پر یوں پھیل جاتی ہے کہ اس کا بوجھ محسوس تک نہیں ہوتا۔ آکاس بیل کی جڑ زمین میں نہیں ہوتی بلکہ اس کی تو جڑ ہوتی ہی نہیں، وہ اپنی بقا کے لئے درخت کے پورے وجود سے ہمکنار ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ درخت کا رس کشید کرتی رہتی ہے۔ اس کی زندگی کا تمام تر دار و مدار درخت کی زندگی پر ہے۔ درخت کو کاٹ دیجئے تو آکاس بیل بھی مر جائے گی۔ شپنگلر کہا کرتا تھا کہ شہر تو ایک درخت کی طرح ہے جس کی جڑیں زمین میں اُتری ہوتی ہیں۔ مجھے شپنگلر کی اس بات سے اتفاق نہیں۔ کم از کم لاہور شہر تو درخت کی طرح نہیں، آکاس بیل کی طرح ہے اور اپنی غذا براہِ راست زمین سے حاصل کرنے کی بجائے درختوں کی شاخوں اور پتوں سے حاصل کرتا ہے۔ شہر لاہور ہمیشہ اہلِ لاہور کے پتوں اور شاخوں ایسے جسموں پر ایک آکاس بیل کی طرح چھایا رہا۔ یوں کہ اس کے اور اہلِ لاہور کے درمیان غیریت کا کوئی پردہ بھی حائل نہ رہ سکا۔ چنانچہ اس میں ایک انوکھی ثقافتی شان پیدا ہو گئی۔ اس کا ایک کردار سا مرتب ہو گیا۔ ایک ایسا کردار جو تماشہ پسندی

کے وصف کے باعث دوسروں سے قطعاً مختلف تھا۔ لاہور یا اہلِ لاہور کی اس تماشہ پسندی کی بہترین مثال اُس وقت سامنے آئی جب آج سے کئی سو برس پہلے کسی ظالم حملہ آور نے لاہور کے باہر شاید منٹو پارک کے علاقے میں قتلِ عام کا تماشہ دکھایا اور اندرون لاہور سے ایک صاحب اپنے دونوں صاحبزادوں کو زرق برق لباس پہنا کر اور انگلیوں سے لگا کر خراماں خراماں لاہور کے کسی قدیم دروازے سے باہر کی طرف آئے۔ دروازے کے باہر ان کی ملاقات اپنے کسی دیرینہ کرم فرما سے ہوئی۔ انہوں نے حال احوال دریافت کیا۔ پھر گھبرا کر کہا "بھاجی اس ہنگامۂ دار و گیر میں ان بچوں کو کہاں لئے جا رہے ہو"۔ جس کے جواب میں ان صاحب نے نہایت معصومیت سے فقط اتنا کہا۔ "یار انہیں کتلام (قتلِ عام) کا میلہ دکھانے لے جا رہا ہوں"۔ قتلِ عام کے میلے اب بھی لاہور میں جا بجا لگتے ہیں۔ کہیں کوئی دوا فروش سڑک کے کنارے سادہ لوح لاہوریوں کی جیبوں پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کرتا ہے، کہیں کوئی نجومی طوطوں کی مدد سے تقدیروں کو بناتا بگاڑتا ہے، کہیں بندروں والا ساس بہو کے ازلی و ابدی تنازعے میں مزید کشیدگی پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کرتا ہے اور کہیں کوئی شقی القلب انسان معصوم بچیوں کے خون سے ہاتھ رنگتا ہے۔ مگر اہلِ لاہور اب ان تماشوں کو قریب سے ذرا کم ہی دیکھتے ہیں، بس دُور ہی دُور سے ایک نظر ڈال کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ کیوں؟ — شاید اس لئے کہ اب لاہور کی مشینی زندگی میں وقت کی کمی کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے یا اس لئے کہ اب لاہور والوں کی تماشہ پسندی کا میلان سرد پڑتا جا رہا ہے۔ یا شاید اس لئے کہ اب لاہور کا فرد اپنے ثقافتی خون سے محروم ہو کر مدقوق ہو رہا ہے۔ مگر یہ صورتِ حال کچھ اچھی نہیں کیونکہ اگر خدانخواستہ لاہور کے اس فرد کو کچھ ہو گیا تو کیا وہ

آکاس بیل زندہ بھی رہ سکے گی جس کا دوسرا نام "لاہور" ہے۔

ہر صبح جب میں ناشتہ کرنے کے بعد لاہور کے جمِ غفیر کا حصّہ بنتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میں نے پورے لاہور کا بوجھ اٹھا رکھا ہے۔ تو کیا (خاکم بدہن) لاہور کی آکاس بیل مر کر ایک بوجھل لاش میں تبدیل ہو چکی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں خود ابھی لاہور میں نو وارد ہوں۔ اس لئے اس آکاس بیل کے بوجھ کو محسوس کر رہا ہوں جسے اہلِ لاہور نے بڑی شان سے ایک شال کی طرح اوڑھ رکھا ہے! شائد یہی بات ہو گی۔ قصور میرا اپنا ہی لگتا ہے۔

کھڑکی

آج سے کئی برس پہلے کی بات ہے کہ ایک دِن میری طبیعت جو ذرا گُدگُدائی تو میں نے گاؤں کو خیرباد کہہ کر شہر میں مستقل قیام کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے سوچا گاؤں میں کیا پڑا ہے ۔ گوبر کی کھاد، جُگالی کرتی ہوئی بھینسیں، ہونقوں کی طرح منہ اُٹھائے ہوئے کسان اور وقت کے زینے سے قدم بہ قدم نیچے کی طرف پھسلتے ہوئے کسانوں کے صبح و شام! بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے جس میں نہ رنگ ہے نہ موج! نہ باتیں نہ گھاتیں! فقط ایک ٹیڑھا میڑھا ہل اور ایک رسّیوں میں جکڑی ہوئی پنجالی اور صدیوں پُرانی دو بیلوں کی ایک جوڑی!

سو ایک روز میں نے اپنا بوریا بستر لپیٹا اور وطنِ عزیز کے ایک بڑے شہر میں جا پہنچا۔ بڑے ہی چاؤ سے ایک مکان کرائے پر لیا، اہلِ خانہ کو ضروریاتِ زندگی فراہم کیں اور پھر اپنوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ یہ سب میرے جگری دوست تھے جن سے برسوں کا یارانہ تھا۔ مگر میں نے ان شیروں کو ان کی کچھار میں اس سے پہلے نہ دیکھا تھا اور اب جو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ ان میں سے ہر شخص پوری طرح قلعہ بند نکلا۔ میں نے جب ان میں سے ایک دوست کے دروازے پر دستک دی تو کافی

عرصہ تک مکان کے اندر مکمل سناٹا چھایا رہا۔ دوسری دستک کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ مجھے شک پڑا کہ شاید نقل مکانی کر گئے ہیں۔ تیسری بار دستک دی تو مکان کی سب سے اُوپر والی منزل کی ایک زنگ آلود کھڑکی ذرا سی کھُلی اور پھر ایک چمکتی ہوئی کھوپری کمال احتیاط سے آہستہ آہستہ باہر کی طرف نکلتی ہوئی دکھائی دی۔ معاً اس کھوپری میں ایک مہین سی درز نمودار ہوئی اور اس درز میں سے ایک منحنی سی آواز پانی کی باریک سی دھار کی طرح اوپر سے نیچے کی طرف لڑھکتی چلی آئی۔ میرا نام دریافت کیا گیا۔ پھر خیریت دریافت کی گئی۔ پھر پوچھا گیا کہ کب آئے اور خیر سے کب واپسی ہو گی؟ اس کے بعد شب بخیر اور کھڑکی کھٹ سے بند! — چند ہی روز میں کھڑکی کے کھُلنے اور بند ہونے کے اس تجربے سے میں اتنی بار گزرا کہ مجھے محسوس ہونے لگا جیسے میں کسی سحر زدہ الف لیلوی شہر میں ہوں جہاں ہر کوئی کسی عفریت کے ڈر سے اپنے اندر چھُپا بیٹھا ہے۔ سو میں نے اس بڑے شہر کو شب بخیر کہا اور واپس چلا، پنجابیوں اور جگالی کرتی ہوئی بھینسوں کی بھامیں آگیا۔ آ تو گیا لیکن کھڑکی کے کھُلنے اور بند ہونے کے تجربے کو پھر کبھی بھلا نہ سکا۔ شاید اسے بھلا نہ سکنے کا باعث یہ تھا کہ میری ساری زندگی گاؤں میں بسر ہوئی تھی جہاں کھڑکی ایسی کوئی شے ہوتی ہی نہیں۔ گاؤں میں تو بے دَر و دیوار سے گھر ہوتے ہیں جن میں رہتے ہوئے کبھی کبھی یوں لگتا ہے جیسے ہم آسمان کے تنبو تلے رہ رہے ہیں۔ ایسے ماحول میں کھڑکی کہاں سے آئے گی: ویسے بھی کھڑکی کی ضرورت تو وہاں پڑتی ہے جہاں دیواریں ہوں۔ دیواریں نظروں کے آگے بند باندھ دیتی ہیں اور انسان کھُلی ہوا، روشنی اور پگھلتے ہوئے تانبے ایسے اُفق کو دیکھنے سے محروم

رہ جاتا ہے اور پھر اپنے بندی خانے میں ایک ایسی کھڑکی کی آرزو کرتا ہے جس کے ذریعے وہ جسمانی طور پر نہ سہی، کم از کم تصوراتی طور پر تو آزاد ہو سکے۔ مگر گاؤں میں چونکہ دیواریں نہیں ہوتیں اور سبز کھیت، پہاڑیاں اور پگھلتے ہوئے تانبے ایسے اُفق گھر کے آنگن ہی میں موجود ہوتے ہیں، اس لئے کھڑکی کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ کھڑکی بیک وقت دیوار میں نقب لگا کر آزاد ہونے کا استعارہ بھی ہے اور اس بات کی علامت بھی کہ قید و بند کی ایک مستقل صورتِ حال نے دم رُکنے کی کیفیت سی پیدا کر دی تھی جس سے کھڑکی نے اپنی باہیں کھول کر رہائی دلا دی۔ چونکہ شہر مرتب ہی دیواروں سے ہوتا ہے اور گھٹن اس کا نوشتۂ تقدیر ہے، اس لئے کھڑکی کی سب سے زیادہ ضرورت بھی شہر ہی کو ہوتی ہے۔ گاؤں اس نعمتِ غیر مترقبہ سے یکسر محروم ہے۔

کھڑکی کسی بے جان سی شے کا نام نہیں۔ جب تک یہ مقفّل رہے تو بے جان ہے یا زیادہ سے زیادہ اسے زندہ درگور کہہ سکتے ہیں مگر جب اس کے پٹ کھُلنے لگیں اور ان میں ایک معمولی سی جھِری بھی نمودار ہو جائے تو امکانات کے کئی سلسلے خود بخود وجود میں آجاتے ہیں۔ بعض کھڑکیاں شرمیلی ہوتی ہیں بس چق کے پیچھے کسی غنچۂ نورس کی طرح نیم وا سی ہوتی ہیں مگر اس طور کہ ان کی ہلکی سی لرزش ہی سے سامنے کی بالائی منزلوں کی ساری کھڑکیاں کھٹ سے پھولوں کی طرح چٹک جاتی ہیں اور دلوں میں دھڑکنوں کا کہرام بپا ہو جاتا ہے۔ بعض کھڑکیاں بیباک ہوتی ہیں، اس قدر کہ جب ان میں سے کوئی ایک کھُلتی ہے تو سارے محلّے کی کھڑکیاں اس کی نگاہ کی گرمی کی تاب نہ لاکر فی الفور اپنی پلکیں جُھکا لیتی ہیں اور پھر پلکوں کے

عقب میں تا دیر کھُسر پھُسر کرتی رہتی ہیں۔ بعض کھڑکیاں دِن بھر مقفل رہتی ہیں۔ مگر شام کے قریب کسی باقاعدہ پروگرام کے تحت کھُلتی ہیں۔ پھر ان میں محلّے کی تیز و طرار زبانیں آمنے سامنے آکر گُل افشانیٔ گفتار کا مظاہرہ کرتی ہیں اور فریقِ مخالف کے سلسلۂ نسب کے تمام نازک یا ٹوٹے ہوئے مقامات سے اُسے آگاہ کرنا اپنا انسانی فرض سمجھتی ہیں۔ مگر اس گُفت و شنید میں زہرناکی یا دشمنی بالکل نہیں ہوتی بلکہ جب یہ تیز و طرار زبانیں بالآخر تھک ہار جاتی ہیں تو "اچھا بہن! باقی کل" کہہ کر لوٹ جاتی ہیں اور ان کے جاتے ہی ساری کھڑکیاں یکے بعد دیگرے بند ہونے لگتی ہیں تا آنکہ گلی کے دونوں جانب چھوٹی اینٹ کی سیہ و سنگین دیواروں کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہتا۔

کھڑکی کی بنیادی طور پر روشنی کا ایک چوکور ٹکڑا ہے جو کھڑکی کے کھُلتے ہی تاریک کمرے کی دیوار پر ایک آئینے کی طرح چمک اُٹھتا ہے۔ جب کھڑکی کھُلتی ہے تو روشنی کا سیلاب جو باہر کہیں رُکا کھڑا تھا بلا تکلف کمرے کے اندر آجاتا ہے۔ روشنی کے اس سیلاب کی نوعیت موسم اور وقت کے مطابق تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ دوپہر کی روشنی، چاند کی چاندنی سے اور چاند کی چاندنی تاروں کی لَو سے بہرحال ایک مختلف مزاج رکھتی ہے۔ مگر اصلاً یہ سب روشنی ہے جو سدا کھڑکی کے کھُلنے کی مُنتظر رہتی ہے۔ دوسری طرف آنکھیں بھی تو روشنی ہی کی متلاشی ہیں۔ آنکھیں کیا ہر ذی رُوح روشنی کی تلاش میں ہے۔ تمام مذاہب روشنی کے قبلے کی طرح منہ کئے صف بہ صف کھڑے نظر آتے ہیں۔ سارے فنونِ لطیفہ روشنی کے ایک نقطے پر مرتکز ہیں۔ جب آنکھیں دیکھتی ہیں تو باقی ساری حسیات باصرہ کے تابع ہو جاتی ہیں اور جب آنکھیں لامتناہی دُوریوں تک پھیلی ہوئی نُورانی کائنات میں کھو جاتی

ہیں تو جسم کی باقی حیات کو گویا سانپ سونگھ جاتا ہے۔ پھر آنکھ کی روشنی اور کائنات کی روشنی میں کوئی بُعد، کوئی فاصلہ باقی نہیں رہ جاتا۔ کھڑکی کی اہمیت اسی بات میں ہے کہ یہ آنکھ کی روشنی کو کائنات کی روشنی سے ہم آہنگ کرتی ہے۔

کھڑکی کمرے کی آنکھ ہے، جس کمرے میں کھڑکی نہ ہو وہ اندھا ہے۔ وہ ٹٹول تو سکتا ہے لیکن دیکھ نہیں سکتا۔ ہر کھڑکی سے ایک نئی SPACE وجود میں آتی ہے جو کمرے کی محدود SPACE پر خندہ زن ہوتی ہے۔ مگر ساتھ ہی کھڑکی کا کھلنا وقت کے متحرک ہو جانے کا عمل بھی تو ہے۔ جب آپ کھڑکی میں سے باہر جھانکتے ہیں تو بیک وقت زمان اور مکان کے وسیع منطقوں کو زیرِ پا لاتے ہیں یا شاید یوں نہیں ہوتا بلکہ جب آپ کھڑکی کھول کر اپنی پلکیں اوپر کو اٹھاتے ہیں تو وقت کے رہوار پر بیٹھ کر ہوا ہو جاتے ہیں اور آپ کو راستہ دینے کے لئے مکان (SPACE) کو دُور دُور تک پیچھے ہٹنا پڑتا ہے۔ کھڑکی سے دیکھنا اپنی ذات کو وسعت آشنا کرنا ہے۔ اس سے مُراد صحیح معنوں میں زندہ رہنا ہے۔

گوئٹے کے بارے میں سُنا ہے کہ جب وہ مرنے لگا تو اس نے کہا تھا:

"روشنی! روشنی"

لوگوں نے سوچا شاید ہذیان بک رہا ہے حالانکہ وہ کمرے کی کھڑکی کھولنے کو کہہ رہا تھا۔

قُدرت نے ہر ذی روح کو سُننے اور دیکھنے کے لئے دو دو کھڑکیاں عطا کر رکھی ہیں اور انسانی معاشرے نے ہمیشہ یہ تلقین کی ہے کہ ان کھڑکیوں کو ہمہ وقت کھُلا رکھا جائے۔ کان کی کھڑکیاں کھولنا تو محاورہ بھی ہے جسے زندہ رکھنے کے

لئے بعض کان کا میل صاف کرنے والوں نے بھی بڑی اہم "خدمات" سرانجام دیں ہیں اور معاشرہ تو بہرحال بڑی سنجیدگی سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہی رہتا ہے کہ یہ کھڑکیاں ہمیشہ کھلی رکھی جائیں۔ ویسے زندگی کی بقا کے لئے کان کی ان کھڑکیوں کو کھلا رکھنا ضروری بھی ہے۔ انسان جب قدیم جنگلی دور کے رحم وکرم پر تھا تو ان کھڑکیوں کو ہر حال میں کھلا رکھتا تاکہ خطرے کی چاپ کو سن کر جانِ عزیز کے بچاؤ کا اہتمام کر سکتا۔ اب شائد ان کا مصرف صرف یہ رہ گیا ہے کہ وہ بزرگوں کی نصیحتوں اور ٹریفک کے اعلانات کو بڑے تحمل سے سن لیا کریں۔ چاہے ساتھ ہی کراس ونٹی لیشن کا مظاہرہ ہی کیوں نہ کریں۔ البتہ آنکھوں کی کھڑکیوں کے سلسلے میں یہ المیہ سامنے آیا ہے کہ معاشرہ ایک طرف تو انہیں کھلا رکھنے کی تلقین کرتا ہے اور دوسری طرف جب یہ کھلتی ہیں تو معاشرے کی پیشانی پر شکنیں ہی شکنیں نمودار ہو جاتی ہیں حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ جو معاشرہ آنکھیں میچ لینے کا اہتمام کرتا ہے اس میں کچھ عرصہ کے بعد تاریکی اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ پھر تاریکی اس کی شخصیت میں بھی گھٹن سی پیدا کر دیتی ہے۔ گھٹن سے سوچ کا عمل متاثر ہوتا ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک روشن اور شفاف معاشرہ تنگ نظری اور منافقت کی زد میں آکر ایک ایسی عمارت میں تبدیل ہو جاتا ہے جس کی تمام کھڑکیاں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چُن دی گئی ہوں۔

خود انسانی تاریخ بھی کھڑکیوں کے کھلنے اور بند ہونے ہی کی ایک داستان ہے۔ وقت کی نظر نہ آنے والی دیوار میں ہر صدی ایک کھڑکی کی طرح ہے۔ جب ایک کھڑکی بند ہوتی ہے تو اس سے ملحقہ دوسری کھڑکی از خود کھل جاتی ہے۔ ہر

کھڑکی کا منظر جُدا اور رنگ مختلف ہے۔ کسی میں سے سرسبز و شاداب کھیت نظر آتے ہیں اور کسی میں سے جلی جُھلسی، خون میں لتھڑی ہوئی پہاڑیاں! کسی میں سے سفید یا کالے لبادوں میں ملبوس اللہ کے نیک اور پاک بندوں کی زیارت ہوتی ہے اور کسی میں سے گھوڑوں کی ننگی پیٹھوں سے چمٹے شقی القلب نقاب پوش دکھائی دیتے ہیں۔ کوئی کھڑکی جب کھُلتی ہے تو آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اور کسی کھڑکی کے کھُلتے ہی اندھیروں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ مگر بیسویں صدی کی ایک خاص خوبی یہ دیکھی ہے کہ اس سو کلومیٹر لمبی کھڑکی کے عین درمیان ایک چوبیس انچ کی چھوٹی سی کھڑکی (بصورت ٹیلی وژن) بھی نمودار ہو گئی ہے۔ یہ ایک عجیب و غریب کھڑکی ہے جس کی ایک طرف تو ہر شخص کے ڈرائنگ روم میں کھُلی ہے اور دوسری طرف زمان و مکان کی حد بندیوں اور ملکوں کی سرحدوں تک کو پار کر گئی ہے۔ میں جب اس چوبیس انچ کی کھڑکی کے سامنے بیٹھتا ہوں تو اس میں آنے والی صدیوں کو بھی دیکھتا ہوں اور گزری ہوئی صدیوں کو بھی! باہر کی دنیا میں ہونے والے واقعات کو بھی اور اندر کی دُنیا میں ہونے والی واردات کو بھی! — میرے لئے یہ کھڑکی ایک جامِ جہاں نما ہے۔ میں جب اس میں دیکھتا ہوں تو مجھے اس کے اندر پورا زمانہ کروٹیں لیتا ہوا نظر آتا ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے میں خود بھی اس کی ایک کروٹ بن جاتا ہوں۔

بسنت

بسنت کا ایک اپنا مزاج، لہجہ اور پہچان ہے۔ مگر یار لوگوں نے اس کے ساتھ "آئی بسنت پالا اڑنت" کے الفاظ منسلک کر کے اس کی انفرادیت پر کاری ضرب لگانے کی کوشش کی ہے۔ اگر بسنت کی پہچان محض اس بات سے ہو کہ یہ جاڑے کی رخصتی یا گرمی کی آمد کا اعلان ہے تو پھر بسنت کی اپنی شخصیت کیا ہوئی؟ اصل بات یہ ہے کہ بسنت، بہار یا خزاں کی طرح ماندگی کا ایک وقفہ نہیں بلکہ وقت کی رسّی میں پڑ جانے والی وہ گرہ ہے جس کا وصفِ خاص آمیز کرنا ہے نہ کہ منہا کرنا! بہار کو لیجیے اس میں سے سردی اور گرمی دونوں منہا ہو جاتی ہیں اور موسم محض ایک نقطے پر آ کر لحظہ بھر کے لئے جم جاتا ہے۔ یہی حال خزاں کا ہے کہ یہ بھی ایک ایسا لمحہ ہے جس میں سے سارے موسم خارج ہو جاتے ہیں۔ مگر بسنت دو موسموں کے سنجوگ کا نام ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جس میں جاڑے کی کپکپی بھی ہوتی ہے اور گرمی کی حلاوت بھی! بسنت نہ تو جاڑے کو ایک پرانے فرسودہ فرغل کی طرح جسم سے نوچ کر پرے پھینکتی ہے اور نہ گرمی کو ایک مہین لبادہ سمجھ کر زیبِ تن کرتی ہے۔ اُس کے لئے گرمی اور سردی دو سہیلیاں ہیں۔ وہ دونوں کے ساتھ مل کر رقص کرتی ہے اور دونوں کے ملاپ کا منظر دکھاتی ہے مگر خود کو ان میں سے کسی

کے تابع نہیں ہونے دیتی۔ یہی بسنت کا اصل کارنامہ ہے۔

بسنت کی پہلی پہچان اس کا رنگ ہے۔ بہار کے رنگ انگنت ہیں مگر بہار دھنک کی طرح متوازن رنگوں کی ایک قوس ہی بن کر طلوع نہیں ہوتی بلکہ رنگوں کے غدر کا منظر دکھاتی ہے۔ البتہ خزاں کا رنگ ایک ہے۔ یعنی پیلا رنگ! یہی رنگ بسنت کا بھی ہے مگر دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ خزاں کی پیلاہٹ لاش کی زردی سے مشابہ ہے جب کہ بسنت کی پیلاہٹ میں زندگی کا لہو موجزن ہوتا ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ خزاں کی پیلاہٹ مرتے ہوئے پتوں کی زردی سے مرتب ہوتی ہے جب کہ بسنت کی پیلاہٹ کھلتے ہوئے پھولوں سے پیدا ہوتی ہے۔ بسنت اور سرسوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ سردی کی یلغار کے سامنے سارے پھول کھیت ہو جاتے ہیں مگر سرسوں پھولتی چلی جاتی ہے۔ بس یہی کھلتا، لہراتا ہوا سرسوں کا رنگ بسنت کا اصل رنگ ہے۔ آپ شہر کی فصیلوں سے آدھ کوس بھی باہر جائیں تو آپ کو زمین پر سرسوں کے چوکور ٹکڑے نظر آنے لگتے ہیں۔ پھر آپ جیسے جیسے آگے بڑھتے ہیں نہ صرف ان ٹکڑوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے بلکہ بڑے ٹکڑے چھوٹے ٹکڑوں کی جگہ لینے لگتے ہیں تا آنکہ تمام چھوٹے بڑے ٹکڑے ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں اور حدِ نظر تک سرسوں کا ایک سمندر سا دکھائی دینے لگتا ہے۔ پھر جب ہوا چلتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے زرد لہروں میں ایک کہرام سا برپا ہو گیا ہو۔ کسی زندہ رنگ کا اتنا بڑا مظاہرہ بسنت کے علاوہ اور کسی موقعہ پر دیکھنے کو شاذ ہی ملے

پچھلے دنوں میرے ایک دوست دس برس امریکہ کے کسی شہر میں رہنے کے بعد جب واپس اپنے وطن پہنچے تو میں نے ان سے پوچھا کہ دیارِ غیر میں انہیں وطن عزیز

کی کون سی چیز سب سے زیادہ یاد آئی ۔ بولے "سرسوں کے کھیت! سرسوں کے کھیتوں میں ہوا کے چلنے سے زرد رنگ کی جو لہریں پیدا ہوتی ہیں بس انہیں دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی تھیں"۔ سو سچی بات یہ ہے کہ بسنت سرسوں کا تہوار ہے۔ یہ سرسوں کے کروڑوں اربوں پھولوں کا ایک میلہ ہے۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ سرسوں کا رنگ صرف کھیتوں تک ہی محدود نہیں ہوتا، کھیتوں کی مینڈھ پر چلتی ہوئی دیہاتی دوشیزہ کے عارضوں میں بھی جھلکتا ہے اور کھیتوں میں ہل چلاتے ہوئے کسانوں کے جسموں سے بھی پھوٹتا ہے۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب یہ آسمان کے آئینے میں بھی منعکس ہونے لگتا ہے اُس وقت بسنت اپنی زندگی کے دوسرے دَور میں داخل ہو جاتی ہے۔

ہر موسم میں زمین ایک نیا چولا بدلتی ہے اور اس چولے کے رنگ ہی سے پہچانی جاتی ہے۔ مگر یہ رنگ زمین سے بُری طرح چپٹا ہوتا ہے۔ بسنت کی خوبی یہ ہے کہ اس میں رنگ زمین سے دامن چھڑا کر آسمان کی طرف پرواز کرتا ہے۔ یہ اُڑان بسنت کی دوسری بڑی پہچان ہے۔ بسنت کے تہوار پر پتنگیں اُڑانے کی رسم دراصل زرد رنگ کے آسمان کی طرف پرواز کرنے ہی کا ایک علامتی مظاہرہ ہے۔ سب جانتے ہیں کہ جب ریشم کا کیڑا ایک لمبی نیند کے بعد بیدار ہوتا ہے تو کیڑا نہیں رہتا بلکہ پروانہ بن جاتا ہے اور پھر جا بجا اُڑنے لگتا ہے۔ گویا ریشم کو پَر عطا ہو جاتے ہیں۔ رنگوں میں بسنت کے پیلے رنگ ہی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ زمین سے پرواز کر کے آسمان میں ہر طرف بکھر جاتا ہے۔ اور اس کے ہلتے ہوئے پَروں کو دیکھ کر دوسرے رنگ بھی اس کا تعاقب کرنے لگتے ہیں۔ ویسے یہ پَروں کا نکل آنا ہی شاید

اصل بات ہے کیونکہ کیڑے کے پَر نکل آئیں تو وہ پروانہ یا تتلی بن جاتا ہے اور لفظ کے پَر نکل آئیں تو وہ شعر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بسنت بھی ایک کرمک ہی تو ہے جس کے پَر نکل آئے ہوں اور جو اب زرد رنگ کی تتلی بن کر ہَوا میں اُڑتا پھر رہا ہو۔ مگر میں کسی ایک تتلی کا ذکر نہیں کر رہا۔ بسنت کے موقع پر جب آسمان میں ہزاروں پتنگ تھرک رہے ہوتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے تتلیاں اُڑ رہی ہوں یا جیسے کسی نے آسمان کے چہرے پر رنگ کا چھینٹا مار دیا ہو۔

بسنت کے موقعہ پر تتلیوں کا اُڑنا رنگ کے علاوہ تخیّل کی پرواز کا منظر بھی پیش کرتا ہے۔ بہار میں جذبہ غالب ہوتا ہے اور جذبہ جب غالب ہو تو بندِ قبا کے کُھلنے سے لے کر گریباں کے چاک ہونے تک کے مناظر جا بجا اُبھر آتے ہیں۔ جذبہ، اندھا اور بہرہ تو خیر ہوتا ہی ہے، اس کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ زمین اور جسم کے ساتھ بُری طرح چمٹا بھی ہوتا ہے۔ بہار میں انسان گویا جسم کے حُجرے میں قید ہو جاتا ہے اور پوری طرح جسم کی حسیات کے رحم و کرم پر ہوتا ہے یُوں لگتا ہے جیسے موسم نے اُس کے پَر کاٹ دیئے ہوں اور وہ دھپ سے زمین پہ آگرا ہو۔ اسی طرح خزاں بھی جذبے کے بوجھ تلے پسی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ بہار کا جذبہ والہانہ، مثبت اور کرارا ہوتا ہے جب کہ خزاں کا جذبہ منفی، تھکا ہوا، اور بوجھل! مگر بسنت میں جذبہ کو گویا پَر لگ جاتے ہیں۔ اور جب جذبہ کو پَر لگ جائیں تو وہ تخیّل کہلاتا ہے۔ تخیّل نام ہے اُس کیفیت کا جو زمین کی بانہوں سے آزاد ہونے اور پھر آسمانی پہنائیوں میں اُترنے پر وجود میں آتی ہے۔ یُوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تخیّل زمین کی تجسیم اور آسمان کی تجرید کے عین درمیان ایک گرہ ہے بعینہٖ جیسے بسنت

جاڑے اور گرمی کے درمیان ایک گرہ ہے۔ میں جب بسنت کے موقعہ پر آسمان میں پتنگ اُڑتے ہوئے دیکھتا ہوں تو میرا تخیل متحرک ہو جاتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ شہر میں رہتے ہوئے انسان تنگ و تاریک گلیوں سے شاذ ہی کبھی باہر جھانکتا ہے۔ رہا آسمان تو اس کی جانب دیکھنے کی اُسے نہ تو ضرورت ہوتی ہے اور نہ خواہش۔ مگر بسنت کے موقعہ پر گلی اور محلّے کا یہ قیدی سال بھر کے بعد شائد پہلی بار مکان کی چھت پر آتا ہے۔ پھر جب وہ پتنگ اُڑاتا ہے تو پتنگ کے ساتھ اس کی نظریں بھی گویا اُڑنے لگتی ہیں۔ پھر اُس کی نظریں پتنگ کو عبُور کر کے آسمان پر مرکوز ہو جاتی ہیں اور وہ حیرت سے دیکھتا ہے کہ اُس کے اُوپر ایک آسمان بھی ہے۔ پتنگ کی خوبی یہ ہے کہ وہ فلک کی بات کو زمین کے محرم تک پہنچانے کا اہتمام کرتا ہے۔ اس کے ذریعے انسان اپنی چھوٹی، تنگ، منافقتوں، نفرتوں اور دُکھوں کی زد میں آئی ہوئی زندگی سے اُوپر اُٹھ کر آسمان کی فراخ اور بے داغ دنیا کا باسی بن جاتا ہے۔ یعنی اُس کے پاؤں تو گھر کی چھت ہی سے جُڑے رہتے ہیں مگر اس کا تخیّل شہر کے بندی خانے سے نکل کر آسمان کی بے نہایت فضا میں پرواز کرنے لگتا ہے۔ تب وہ حیرت کے ساتھ سوچتا ہے کہ کائنات کتنی بڑی ہے اور اس کائنات کو بنانے والا کتنا عظیم ہے اور اس کے اپنے چھوٹے چھوٹے دُکھ اتنی بڑی کائنات میں کتنے بے معنی ہیں؛ معًا وہ اپنی ذات پر سے جسم کے بوجھ کو اُتار کر خود بھی ایک پتنگ کی طرح فضائے بسیط میں اُڑنے لگتا ہے۔ ایک حقیر کیڑے سے ایک زرد رنگ کی تتلی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہی بسنت کی آخری بڑی پہچان ہے کہ وہ انسان، حیوان، درخت، پھُول، فضا اور ہوا۔ ہر شے کو اپنے رنگ میں

رنگ لیتی ہے۔ ہر شے کو اپنا جزوِ بدن بنا لیتی ہے۔ بسنت کسی ایک مُلک یا گروہ کا تہوار نہیں پوری دھرتی کا تہوار ہے۔ بلکہ اسے تہوار بھی نہ کہیئے۔ یہ تو ایک زندہ پُراسرار ہستی ہے، سرسوں جس کا بدن ہے اور پتنگ جس کی زبان!

ٹھنڈا برف ہات

اُس روز میں صبح ہی سے اُن کھیتوں میں گھوم رہا تھا جن میں گندم کی نئی قسم پادان کاشت کی گئی تھی۔ مجھے یہ قسم بہت اچھی لگی تھی۔ اس کے پودوں نے گندم کی عام اقسام کی بہ نسبت زیادہ شاخیں نکالی تھیں۔ خوشوں کی لمبائی بھی مناسب تھی۔ میں خوش تھا کہ امسال شائد گندم کی کمی پوری ہو جائے۔ پھر اچانک سڑک پر ایک جیپ آ رکی اور زراعت کے چند ماہرین جیپ سے نکل کر میری طرف آ گئے۔

نجانے ہم کتنی دیر کھیت کی مینڈھ پر کھڑے پادان کے بارے میں باتیں کرتے رہے کہ ہمیں وقت کی گزران کا احساس تک نہ ہو سکا۔ ہمیں پتہ بھی نہ چلا کہ کب سورج غروب ہوا، کب شام اپنے سُرخ عروسی لباس میں ڈولی سے اُتری، کب اس کا سہاگ اُجڑا اور کب اس کی سرمئی آنکھوں میں ایک موٹا سا تابدار آنسو جگمگا اٹھا۔ میں نے چونک کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کھیتوں نے کالی عبا اوڑھ لی تھی اور رات کے رخسار بھیگ سے گئے تھے۔ میں نے بہ عجلت مہمانوں سے اجازت طلب کی اور اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا جو وہاں سے تقریباً ڈیڑھ کوس کے فاصلے پر تھا۔ وہ لوگ جیپ میں بیٹھ کر پختہ سڑک کی طرف چلے گئے۔ چند لمحوں تک مجھے جیپ کی سُرخ بتی

نظر آتی رہی۔ پھر وہ بتی بھی غائب ہو گئی۔

اب مکمل اندھیرا تھا اور تنہائی! میں چھڑی گھماتا تیز تیز گاؤں کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر چلتا رہا اور پھر اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کسی شے نے اپنا ٹھنڈا برف ہاتھ میری گردن کی پُشت پر رکھ دیا ہے۔ میں نے چونک کر اپنے پیچھے کی طرف دیکھا اندھیرے میں ملفوف درخت کبڑے فقیروں کی طرح قطار اندر قطار کھڑے مجھے گھور رہے تھے اور گندم کے کھیت گھنی اور لمبی سیاہ جٹاؤں کی طرح ایک دوسرے سے اُلجھے ہوئے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ میری گردن پر ٹھنڈے ہاتھ کا لمس کھیت میں پیدا ہونے والی کسی ایسی سرسراہٹ کے باعث ہو جس کی اطلاع میرے جسم کو میرے دماغ سے بہت پہلے ہو گئی تھی۔ ویسے میرے دماغ کو دنیا و مافیہا سے یوں بے خبر نہیں ہونا چاہیئے تھا کیوں کہ رات کے وقت یہ علاقہ ہرگز محفوظ نہیں تھا۔ جنگلی سوّروں نے اس علاقے میں خاصا اودھم مچا رکھا تھا اور ابھی چند ہی روز پہلے ایک جنگلی سوّر نے ایک کسان کو بُری طرح زخمی کر دیا تھا۔ پھر گرمی کی آمد آمد بھی تھی جس کے باعث سانپ بھی نکلنا شروع ہو گئے تھے۔ اندھیرے میں پیدل چلتے ہوئے کسی بھی وقت سانپ پر پاؤں آ سکتا تھا۔ لہٰذا جب جسم کے ساتھ ساتھ میرا دماغ بھی جاگ اُٹھا اور خطرات سے پوری طرح آگاہ ہو گیا تو میں نے پاؤں زمین پر زور زور سے مار کر چلنا شروع کر دیا اور چھڑی سے زمین کو ٹھکرانے بھی لگا مگر اس حرکت سے فی الفور دو نتائج برآمد ہو گئے۔ ایک تو یہ کہ کھیتوں میں جگہ جگہ سرسراہٹ سی ہونے لگی اور ایک بار تو کوئی شے تیزی سے میرا راستہ بھی کاٹ گئی، دوسرا یہ کہ میرے اپنے قدموں کی چاپ میرا تعاقب کرنے لگی اور اس چاپ کو سُن کر سردی کی ایک لہر سی میری گردن پر سے پھسلتی ہوئی میرے سارے جسم پر رینگنے لگی

اس وقت تو میں اس کیفیت کا تجزیہ نہ کر سکا مگر اب سوچتا ہوں کہ خوف مجھ پر شاید باہر سے حملہ آور نہیں ہوا تھا بلکہ میرے اندر سے باہر آیا تھا اور اندر سے نکلنے والا یہ خوف نسل کی زیریں منازل سے آیا تھا۔ یہ اس زمانے کی یادگار تھا جب انسان کو لباس کی ڈھال، چھت کا سایہ، خود کار ہتھیاروں کی کمک اور شخصیت کا زرہ بکتر نصیب نہیں تھا۔ اُن دنوں وہ ہر اعتبار سے برہنہ تھا اور اپنے آپ سے براہِ راست متعارف! مگر پھر بوجھل لبادوں نے اُسے پوری طرح ڈھانپ لیا اور وہ شخصیت کی کال کوٹھڑی میں دبک کر بیٹھ رہا مگر اُس روز اندھیرے اور سناٹے اور تنہائی کے سفر میں جب خوف میرے اندر سے باہر کو لپکا تو اُس کے ساتھ ہی یہ قدیم انسان بھی باہر نکل آیا۔ یا شاید یوں ہوا کہ جن بوتل میں قید تھا۔ جب خوف کی پہلی ہی ضرب سے یہ بوتل چکنا چور ہوئی تو جن آزاد ہو گیا۔ اب دونوں ازلی و ابدی دشمن ایک دوسرے کے رُوبرُو تھے دونوں کے درمیان تہذیب اور شخصیت کی کوئی دیوار حائل نہیں تھی۔ اُس وقت مجھے محسوس ہوا تھا کہ میرے ہاتھ میں چھڑی نہیں بلکہ نیزہ ہے اور میرے جسم پر لباس نہیں بلکہ ایک موٹی کالی کھال ہے۔ اب میں قدیم زمانے کا ایک وحشی تھا جو خوف کے وجود کو پوری طرح پہچانتا تھا۔ میں نے اس سے قبل اپنی ذات میں چھُپے ہوئے اس وحشی کو کبھی نہ دیکھا تھا بلکہ میں تو اس کے وجود تک سے آشنا نہ تھا مگر اب کہ وہ میرے رُوبرو آگیا تھا تو مجھے اس سے مصافحہ کر کے بے حد خوشی ہوئی کہ وہ میرا کالی روپ تھا۔ غیر مہذّب، کھُردرا، سفّاک اور خونخوار روپ مگر ایک انوکھی قوت کی علامت! وہ تخلیق کا سرچشمہ تھا، سُرخ لہو کی ایک تڑپتی ہوئی بُوند اور جذبے کی ایک متحرک تلاش تھا۔ بس یہ ہوا تھا کہ خوف نے میرے جسم سے چپکے ہوئے تہذیب کے زرہ بکتر کو توڑ

کر اسے آزاد کر دیا تھا۔ اُس وقت مجھے خوف کی افادیت کا پہلی بار احساس ہوا لوگ اسے بزدلی پر محمول کرنا چاہیں تو یہ بات بھی کچھ ایسی غلط نہیں مگر حقیقت شائد یہ ہے کہ خوف انسان کو شخصیت کے زندان سے رہائی دلاتا ہے بعینہٖ جیسے تہتک شخصیت کو پُرزے پُرزے کر کے انسان کو لمحہ بھر کے لئے آزاد کر دیتی ہے کیسے! میں عرض کرتا ہوں کہ کیسے؟

قصہ یہ ہے کہ ہر فرد کی نظروں میں اس کی اپنی عزّت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ وہ اس کی حفاظت کے لئے اپنے گرد اَنا اور غیرت، خودی اور خود پسندی کی دیوار سی کھڑی کر کے اس پر جلی حروف میں لکھ دیتا ہے کہ یہ شارع عام نہیں ہے اور خلاف ورزی کرنے والے کو تہِ تیغ کر دیا جائے گا۔ اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ خلقِ خدا بھی اُس کی اُسی طرح عزّت کرے جیسے کہ وہ خود کر رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کی ساری زندگی اپنی اس "دلکش اور موہنی شخصیت" کے تحفظ میں بسر ہوتی ہے اور وہ کبھی یہ برداشت تک نہیں کرتا کہ کوئی میلی آنکھ اس کی شخصیت کو داغدار کرنے کی کوشش کرے۔ ایسے میں اگر کوئی اُس کی ہتک کرے مثلاً اگر اُسے گالی دے تو اُسے محسوس ہوتا ہے جیسے وہ خود اپنی نظروں میں ذلیل ہو گیا ہے، ٹوٹ پھوٹ گیا ہے اور اُس کا اُسارا ہوا قلعہ دھڑام سے زمین پر آن گرا ہے مگر دوسرے ہی لمحہ اُسے محسوس ہوتا ہے جیسے وہ پہلی بار خود کو خودی کے آئینے میں سے نہیں بلکہ براہِ راست دیکھ رہا ہو۔ گویا گالی اُس کی شخصیت کو تار تار کر کے اُسے دعوت دیتی ہے کہ وہ خود کو از سرِ نو مرتب کرے۔ سوچتا ہوں کیا ایک عالم میں قتل ہونے اور دُوسرے میں دوبارہ زندہ ہونے کا یہ عمل پوری کائنات کے تخلیقی عمل سے مشابہ نہیں؟ درویش یا سادھو اس راز کو

خوب جانتا ہے جبھی تو وہ اپنی "چھوٹی مَیں" کو ذلیل کرکے توڑ پھوڑ دیتا ہے تاکہ غرور اور تمکنت سے دست کش ہو کر "بڑی مَیں" کے آستان تک پہنچنے کے قابل ہو۔ ویسے بھی بیج کا چھلکا ٹوٹے تو اس کے اندر کے مغز کو تخلیقی سرگرمی کی اجازت ملتی ہے شخصیت کا بوجھ اُترے تو انسان تخلیق کے قابل ہوتا ہے ورنہ وہ تو ایک ایسا باوقار، عزت مآب، اور خود پسند شہری ہے جس کی قسمت میں موت کے بعد بھی سنگِ مرمر کا کتبہ لکھا ہے۔ وہ مر کر بھی آزاد نہیں ہوتا!

مگر خیر میں کہہ رہا تھا کہ مجھے اُس رات زندگی میں پہلی بار خوف کی کارکردگی کا بھرپور احساس ہوا اور پہلی بار شخصیت کے ریزہ ریزہ ہونے اور اندر کے قیدی کے باہر آنے کا منظر دکھائی دیا اور پھر مجھے محسوس ہوا جیسے میں صدیوں کی نیند سے بیدار ہو کر فطرت کے دائرے میں سمٹ آیا ہوں۔ فطرت میں ہر طرف خوف ہی خوف ہے میں کسی بات پر خوش ہو کر بھی تالی بجاؤں تو چڑیاں اور تتلیاں اور گلہریاں دھڑکتے دلوں اور کانپتے جسموں کے ساتھ ہَوا ہو جاتی ہیں۔ ایک بار مجھے ایک ننھی سی چڑیا کو اپنے ہاتھ کی مٹھی میں لینے کا اتفاق ہوا تھا۔ مجھے آج تک اس کے دل کی دھڑکن یاد ہے جو میری ہتھیلی سے ٹکریں مار رہی تھی۔ خوف نے بڑے جانوروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے کیڑوں تک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور اُن کی زندگیاں ہمہ وقت خوف کی کھنچی ہوئی تلوار کے سائے میں بسر ہوتی ہیں۔ شاید یہی ان کی بیداری اور آزادی کا راز بھی ہے جب زندگی سے خوف منہا ہو جاتا ہے تو انسان کو نیند آ جاتی ہے۔ کسی زمانے میں بڑے بڑے ڈینوسار شاید اسی لیے نیم غنودگی کی حالت میں رہتے تھے کہ انہیں کسی سے خطرہ نہیں ہوتا تھا مگر پھر یہی نیم غنودگی اُن کی اجتماعی موت کا پیش خیمہ بھی

ثابت ہوئی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آج کے مادی تحفظات نے انسان کو بھی تہذیبی اور روحانی غنودگی کی زد پر لا کھڑا کیا ہے اور اب صرف ایک جیتا جاگتا خوف ہی اسے افیونیت کے عالم سے بیدار کر سکتا ہے؟ شائد یہی وجہ ہے کہ جب کسی شخص کی زندگی میں کوئی بحرانی دَور آتا ہے تو وہ لحظہ بھر کے لئے ہڑبڑا کر بیدار ہو جاتا ہے مگر اِدھر طوفان گزرا اور اُدھر وہ دوبارہ خوابِ خرگوش میں چلا گیا۔ مگر نہیں! خوابِ خرگوش کیوں کہیں، خرگوش تو ہمہ وقت خوف کی زد میں ہوتا ہے۔ کبھی کسی خرگوش کے سینے پر ہاتھ رکھ کر دیکھیں۔ اس کا دل بھی آپ کے ہاتھ کی دیوار سے دیوانہ وار ٹکریں مارتا ہوا محسوس ہوگا۔ خوف دراصل برقی رَو کا وہ جھٹکا ہے جو فطرت کے رُکتے ہوئے دِل کو دوبارہ متحرک کر دیتا ہے۔ مگر ضرورت سے زیادہ تحفظات نے انسان کو اس برقی جھٹکے سے محروم کر دیا ہے۔ بہرحال یہ تمام باتیں تو میں اب سوچ رہا ہوں۔ اس رات میرے لئے ڈیڑھ میل کی مسافت صدیوں کا ایک دہشت انگیز سفر تھا۔ ایک ایسی خطرات سے پُر اوڈیسی جسے شائد پوری طرح بیان کرنا بھی ممکن نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میرا یہ سفر بس چند ہی لمحوں پر محیط رہا۔ جلد ہی مجھے اپنے گاؤں کی روشنیاں نظر آگئیں اور جیسے جیسے میں گاؤں کے قریب آتا گیا کوئی طاقت بتدریج میری اشیاء مجھے لوٹاتی چلی گئی۔ پہلے نیزے کی جگہ ایک مازک سی سُبک اندام چھڑی نے لے لی۔ پھر میرے جسم پر سے موٹی کالی کھال رُخصت ہوئی اور اس کی جگہ لباس نمودار ہوگیا۔ پھر وقار، نخوت اور خود پسندی کا گھمبیر احساس ایک بھاری عمامے کی طرح میرے سر پر آن گرا۔ میری چال میں خود نمائی اور نگاہوں میں ہمہ بینی آگئی اور دماغ کے شیش محل میں تہذیب کے سارے اثاثے حکمت اور منطق اور فلسفہ اور ادب اور ہزار دوسرے

مظاہر مؤدب درباریوں کی طرح باادب باملاحظہ ہوشیار آگے بڑھے اور اپنی اپنی مسندوں پر براجمان ہوگئے۔ بوتل کی ساری کرچیاں کھٹ سے جُڑ گئیں اور جب میں نے کارک کو مضبوطی سے بند کیا تو مجھے بوتل کے اندر قدیم انسان ایک کمر شکستہ قیدی کی طرح تہہ میں بیٹھتا ہوا دکھائی دیا اور پھر وہ نظروں سے بالکل غائب ہوگیا۔ اب میری آواز میں اعتدال اور لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔ میں نے گھر میں داخل ہوتے ہی اپنے ملازم کو آواز دی اور جب وہ میری آواز پر اپنے کمرے سے باہر آیا تو میں نے اُسے بتایا کہ وہ بُزدل ہے اور اندھیرے کے خوف سے اندر چھُپا بیٹھا ہے۔

کچھ مُسکراہٹ کے بارے میں

مُسکرانا ایک تہذیبی عمل ہے ۔ یہ وہ مقام ہے جہاں کرّے سے کرّے جذبات موم کی طرح پگھل کر ایک ایسی کیفیت میں ڈھل جاتے ہیں جو پُر اسرار بھی ہوتی ہے اور معنی خیز بھی۔ چہرہ سنجیدہ ہو یا ہنسی کی زد میں آیا ہو، اس کی نوعیت کے بارے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش مشکل ہی سے نکل سکتی ہے لیکن متبسم چہرہ امکانات کا ایک جہانِ گزراں ہے۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ گوشت کی ان دو باہم پیوست قاشوں پر جو سپیدۂ سحر نمودار ہوا ہے وہ معاً قہقہے کی جوالا میں پھوٹ بہے گا یا تلوار کی دھار بن جائے گا یا دیکھتے ہی دیکھتے نیلے آسمان میں اچانک اُبھر آنے والے لکّۂ ابر کی طرح دوبارہ نیلاہٹ میں ضم ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ مسکراہٹ کو ایک نظر دیکھ لینے کے بعد آپ کے دل میں پیدا ہونے والی ساری امیدیں اور وسوسے غلط ثابت ہوں اور وہ محض آہ و زاری کا نقطۂ آغاز ثابت ہو جائے۔ وثوق کے ساتھ کچھ کہنا ممکن نہیں!

میں نے مُسکراتے ہوئے شخص میں ہمیشہ بڑی دلچسپی لی ہے۔ ایسے شخص سے ملنے اور پھر اس کے دل میں غوطہ زن ہونے کو میں ایک ایسی سعادت سمجھتا ہوں جو

عام لوگوں کو بہت کم نصیب ہوتی ہے۔ دوسری طرف وہ شخص جس کے چہرے پر سنجیدگی کا درم مستقل طور پر آویزاں ہو چکا ہو، ایک کھُلی کتاب کا درجہ رکھتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ جب میں اس شخص کے سامنے آؤں گا تو وہ فائل سے اپنی بوجھل نظروں کو اٹھا کر انہیں میرے چہرے پر چپکا دے گا اور اس کے بعد یا تو اپنی آستین سے ایک کالا مکروہ سا ہاتھ نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دے گا یا پھر میز پر سے اُس مکروہ ہاتھ کو سمیٹ کر اپنی جیب میں ٹھونس لے گا اور بس! ایسے مہربان سے اس کے علاوہ کسی اور ردِ عمل کی توقع بالکل بے سُود ہے۔

یہی حال میرے بیشتر ہم وطنوں کا ہے جنہیں کارکنانِ قضا و قدر نے نجانے کب سے سنجیدگی میں بھگو کر اس طور ہم رنگ کر دیا ہے کہ اب ان کے ظاہر و باطن میں امتیاز کرنا بھی ممکن نہیں رہا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ معاشرہ مشتعل رنگوں کا ایک فوارہ بننے کے بجائے بڑ کے درخت کی طرح بے حس و حرکت ہو جائے۔ اس حد تک کہ جب کوئی طوفان آکر چلا جائے تو ہم فقط اتنا ہی کہہ سکیں کہ ذرا دیر کے لئے ہوا چلی تھی جس سے بڑ کی ٹہنیوں میں ہلکی سی جنبش پیدا ہوئی تھی اور پتے کچھ دیر کے لئے کھڑکھڑائے تھے لیکن جب ہوا مر گئی تو بڑ کا درخت پھر سے مراقبے میں چلا گیا اور غنودگی سے دوبارہ لطف اندوز ہونے لگا۔ ایسا معصوم معاشرہ تو کہیں صدیوں کی ریاضت کے بعد ہی ظہور میں آتا ہے۔ سنجیدہ شخص کی طرح یہ بھی ایک ایسی کھُلی ہوئی کتاب ہے جسے ہر سیاسی لیڈر بآسانی پڑھ سکتا بلکہ حفظ بھی کر سکتا ہے اور جب چاہے اس کے اوراق میں قطع و برید کر کے ثوابِ دارین بھی حاصل کر سکتا ہے۔

سنجیدگی شخصی بھی ہوتی ہے اور اجتماعی بھی مگر اس کا ایک خاص وصف یہ ہے

کہ ہلکی سی گدگداہٹ بھی اسے ہنسی کے فوارے میں تبدیل کرسکتی ہے۔ یقین نہ آئے تو کسی بھی گلے سڑے پروفیسر کی دونوں آنکھوں کے عین درمیان ناک کی گدی کو انگشتِ شہادت سے مَس کیجئے اور پھر دیکھ لیجئے کہ سنجیدگی کا یہ پہاڑ کھٹ سے ہنسنے لگے گا۔ سنجیدہ شخص کی یہ خاص نشانی ہے کہ وہ اپنے چاروں اطراف کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ مگر اِدھر آپ کی انگلی نے اُسے ہلکا سا گدگدایا اور اُدھر کمال معصومیت سے اس کی چمکدار بتیسی آپ کو درشن دے گئی۔ ہنسی اور سنجیدگی یہ دونوں ایک ہی چاقو کے دو پھل ہیں۔ یک رنگ کھُردرے اور بے آب! مگر مسکراہٹ ان سے ایک قطعاً الگ اور جُدا کیفیت کا نام ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مسکراہٹ کا کوئی ایک رنگ نہیں ہوتا اور نہ اس کی منزل کا تعین ہی ممکن ہے۔ مجھے اپنی زندگی میں مسکراہٹ کے کئی رنگ دیکھنے کی توفیق ہوئی اور ہر بار مجھے محسوس ہوا کہ جیسے میں اس دیوی کو پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ مثلاً مجھے یاد ہے کہ کالج کے ایام میں دسمبر جنوری کی قاتل سردی کے باوجود مجھے ہر روز صبح سویرے موچی دروازے سے گورنمنٹ کالج تک سائیکل پہ جانا پڑتا تھا۔ مگر حالت یہ ہوتی تھی کہ ہاتھ ہینڈل پر جم جاتے تھے اور انہیں سائیکل کو موڑنے کے لئے استعمال کرنا بہت مشکل ہوتا تھا۔ ایک روز اسی جانکنی کے عالم میں سامنے سے آتے ہوئے ایک ٹھٹھرے ہوئے سائیکل سوار سے میرے سائیکل نے مصافحہ کیا اور اس کے بعد دونوں شہسوار اور ان کے راہوار برف کی سلوں کی طرح کول تار کی ٹھنڈی سڑک پر کھیت ہوگئے۔ چند ہی لمحوں کے بعد سڑک پر لیٹے لیٹے میں نے دیکھا کہ ایک سفید ریش بزرگ ہمارے درمیان آکر بڑے اطمینان سے کھڑے ہوگئے اور پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر عجیب شرارت بھرے

انداز میں مسکرائے۔ اس کے بعد وہ اُسی اطمینان سے چہل قدمی کرتے ہوئے ایک طرف کو نکل گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت اُن فرشتہ سیرت بزرگ کی طنزیہ مسکراہٹ برف کی ایک تلوار بن کر میرے سینے میں اُتر گئی تھی اور آج تک وہیں دفن پڑی تھی کہ بھولی بسری یادوں کے کانٹے سے چپک کر باہر آگئی۔

یادوں کی بات چھڑی ہے تو مجھے ایک اللہ لوک بھی یاد آگئے ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے فوراً بعد کا واقعہ ہے کہ میں ایک روز کشمیر کی سیر کو نکلا اور پھر پہلگام سے آگے اُس وادی میں بڑھتا چلا گیا جہاں سے ایک دشوار گذار راستہ امرناتھ کی طرف جاتا ہے۔ پھر ایک مقام پر مجھے ایک ننگ دھڑنگ اللہ لوک برف کے ایک پُل پر بیٹھے ہوئے دکھائی دیئے۔ میں خود دوہرے تہرے کپڑوں میں ملبوس تھا اس لئے اس "عجوبۂ روزگار" کو دیکھ کر خوش ہوا جو تہذیب و تمدن کی جملہ خرافات سے بے نیاز محض بدن کے لباس میں ملبوس تھا لیکن جلد ہی میری نظریں اُس کے ہونٹوں پر آکر جم گئیں۔ میں نے دیکھا کہ وہاں ایک ایسی مسکراہٹ نقش تھی جو اچانک "جان لینے" بلکہ "پہچان لینے" کے احساس سے جنم لیتی ہے جیسے کہہ رہی ہو کہ قلب کی طمانیت اور روح کے سکون سے میرا خمیر تیار ہوا ہے، حیرت مجھ میں برقِ تپاں کی طرح دوڑ رہی ہے اور عرفان کی شیرینی سے میرے ہونٹ جُڑے ہوئے ہیں۔ بات بہت پُرانی ہے اور یادیں اکثر دھوکا بھی دیتی ہیں۔ اس لئے ممکن ہے میرا یہ احساس زیبِ داستاں کی جبلت کے تحت کچھ زیادہ ہی جاندار ہو گیا ہو اور بات اس سے زیادہ کچھ نہ ہو کہ سخت سردی نے اللہ لوک کے ہونٹوں پر نیلے رنگ کی مسکراہٹ ثبت کر دی تھی جسے میں روحانیت کی معراج سمجھا۔ تاہم اُس مسکراہٹ کی پُراسراریت مجھے آج تک یاد ہے

اور میں اسے فریبِ نظر سمجھنے سے قاصر ہوں۔

سنجیدگی اور ہنسی۔ یہ دونوں اظہارِ جذبات کے وہ قبیح نمونے ہیں جو انسانی زندگی کے ابتدائی ایام ہی میں منظرِ عام پر آگئے تھے۔ مثلاً قدیم انسان کو جن دو اہم جذبوں سے کام لینا پڑتا تھا ان میں سے ایک تو وار یا فرار کا جذبہ تھا اور یہ نوعیت کے اعتبار سے قطعاً سنجیدہ تھا۔ دوسرا جذبہ دشمن کو تہِ تیغ کرنے پر ہنسی کی چیخوں کی صورت میں برآمد ہوتا تھا اور یہ محض فاضل قوت کے اخراج کی ایک صورت تھی، تاہم ان دونوں صورتوں میں جذبے کا حیوانی پہلو ہی پوری شدت سے سامنے آتا تھا۔ پھر ایک روز مسکراہٹ کہ ضبطِ نفس کی ایک صورت ہے، کسی بغلی دروازے سے اُس کے ایوانِ حیات میں داخل ہوئی۔ یہی وہ لمحہ تھا جس میں انسانی تہذیب نے جنم لیا اور انسان نے سنجیدگی کے بوجھ میں کمی کر کے اور ہنسی کو کھلنے سے باز رکھ کر اندھیرے اُجالے اور "ہونے نہ ہونے" کی پُراسرار اور چھوئی مُوئی سی فضا پیدا کر دی۔ آج یہی پُراسرار سی فضا اُس کی تہذیب کا حاصل ہے۔ کیسی خوبصورت بات ہے کہ جذبہ دِل کی گہرائیوں سے اس آرزو کے ساتھ برآمد ہو کہ وہ اپنی اوّلین فرصت میں کھِل کر پھول بن جائے گا مگر آپ اُسے ایک نیم وا غنچے کے مرحلے سے آگے نہ جانے دیں۔ اُردو شعراء کی سب سے بڑی عطا یہی ہے کہ انہوں نے آہ و زاری کے قومی مسلک کو ہمہ وقت ملحوظ رکھنے کے باوصف نیم وا غنچے کی اس نایاب کیفیت کو حرزِ جان بنانے کی ہمیشہ کوشش کی ہے۔ یوں بھی غنچہ میں کلی کی سنجیدگی اور پھول کی کھلکھلاہٹ کا ایک حسین سا امتزاج موجود ہوتا ہے جو اُسے ایک نہایت پُراسرار سی جنس میں تبدیل کر دیتا ہے اور شعرا پُراسراریت کے ہمیشہ سے دلدادہ رہے ہیں۔ چنانچہ

مسکراہٹ سے ان کا تعلقِ خاطر سمجھ میں آتا ہے۔

سنجیدگی اور ہنسی۔ یہ دونوں اپنے اپنے خطۂ زمین سے پوری طرح منسلک ہیں مگر مسکراہٹ کا کردار بین الاقوامی ہے۔ وہ نہ صرف ہونٹوں کے طول و عرض پر پھیلتی اور سکڑتی رہتی ہے بلکہ مُلک مُلک کی سیر کرنے پر بھی ہمیشہ سے مائل ہے مگر اس کا دائرۂ اثر افقی ہی نہیں عمودی بھی ہے۔ عمودی یوں کہ ہر قوم کی تاریخ میں مسکراہٹ کا ایک ایسا دَور ضرور آیا ہے جب وہ دوسری قوموں کو تہِ تیغ کرنے کے بعد اپنی ہی ذات میں گُم ہوئی اور پھر اپنا ہی عرفان حاصل کر کے مسکرانے لگی۔

مسکراہٹ اور تہذیب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مجھے سنجیدہ قوم سے بڑا ڈر لگتا ہے کیوں کہ یہ پلک جھپکنے میں ہٹلر اور قیصر ایسے جانباز پیدا کر لیتی ہے اور ہنستی ہوئی قوم سے مجھے نفرت ہے کہ یہ نرگسیت کے برملا اظہار کا ایک نہایت قبیح نمونہ ہے اور اس میں خوجی اور ڈان کہوٹے ایسے عاشقِ زار آناً فاناً پیدا ہو جاتے ہیں، مگر ایک مسکراتی ہوئی قوم ضبطِ نفس، تہذیبی نکھار، جاننے اور پہچاننے کے مراحل سے شناسائی کا ایک کھُلا ثبوت ہے۔ مسکراہٹ اپنی ملائمت اور نرمی کے باعث دلکش اور دلنواز تو ہے ہی۔ تاہم اگر اس میں خدانخواستہ زہرناکی کا عنصر شامل ہو جائے تو بھی یہ فریقِ مخالف کو ہنسی کی طرح ذلیل نہیں کرتی بلکہ اُسے محض ذرا سا کچوکا لگا کر اور یُوں اُسے دوبارہ باادب باملاحظہ ہوشیار رہنے کی تلقین کر کے خاموش ہو جاتی ہے کیسی عمدہ بات ہے!

بظاہر مسکراہٹ مسرت کا ایک کوندا ہے جو دیکھنے والے کی آنکھوں کو خیرہ کر کے دوبارہ اندھیرے میں غائب ہو جاتا ہے۔ مگر مسکراہٹ کے بعض دائمی نمونے

بھی ہیں جو انسان کو صدیوں تک ایک پُراسرار سی گُدگُداہٹ سے لرزاتے رہے ہیں مثلاً بدھ کے ہونٹوں پر جمی ہوئی سکونِ قلب کی مسکراہٹ! - مگر میں ذاتی طور پر اس مسکراہٹ میں چھپے ہوئے حقت کے احساس کو فتح مندی کے اس لطیف نسوانی احساس سے کم تر سمجھتا ہوں جو مونالیزا کی مسکراہٹ میں مستور ہے۔ مونالیزا کی مسکراہٹ میں ایک ایسا وقار ہے جو اپنی تخلیقی حیثیت کے شعور ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ شاید اسی لئے بعض لوگوں نے مونالیزا کو ایک حاملہ عورت بھی قرار دیا ہے۔ کچھ بھی ہو مونالیزا کی گوری مسکراہٹ ایک باشعور تخلیق کار کی مسکراہٹ ہے۔ کسی تخریب کار کالی کا خندۂ دنداں نما ہرگز نہیں۔

کتابوں کی معیت میں

جہاز کا خطرے کا سائرن چیخ اٹھا ہے اور سائرن کی آواز کے ساتھ ہی پورے جہاز میں افراتفری مچ گئی ہے۔ جہاز کے کپتان سے میرے دیرینہ مراسم ہیں۔ اس لئے اُس نے مجھے ایک لائف بوٹ مہیا کر دی ہے تاکہ میں کسی قریبی جزیرے میں پناہ لے سکوں مگر اس نے مجھے اپنے ساتھ جہاز کی لائبریری سے صرف تین کتابیں لے جانے کی اجازت دی ہے۔ سوال یہ ہے کہ میں کون سی کتابیں اپنے ساتھ لے جاؤں اور پھر بتاؤں کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ وقت تنگ ہے اور مجھے فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنا ہے۔ یہ بات ایسے ہی ہے جیسے کہا جائے کہ میں اپنے بچوں میں سے کسی ایک کو اپنے ساتھ لے جاؤں اور باقی کو جہاز کے ساتھ ہی سمندر میں غرق ہونے کے لئے چھوڑ دوں۔ ایسی صورت میں میرا ردِ عمل تو یہ ہوگا کہ اپنی بجائے اپنے بچوں کو لائف بوٹ میں سوار کر دوں اور خود ڈوب جاؤں۔ یہی صورت کتابوں کی ہے۔ اگر یہ کتابیں انتہائی نادر و نایاب صحیفے ہوتے تو میں انہیں لائف بوٹ میں بھر کر جزیرے کی طرف بہا دیتا اور خود جہاز کے ساتھ ہی سمندر کی تہ میں اتر جاتا۔ مگر چونکہ ان کتابوں کی لاکھوں جلدیں پہلے ہی دُنیا میں بکھری پڑی ہیں۔ اسی لئے ظاہر ہے کہ سوال کتاب کی بقا کا نہیں، میری اپنی بقا کا

ہے۔ نجانے مجھے جزیرے میں کتنا عرصہ گزارنا پڑے۔ سُنا ہے بعض مسافروں کو سال ہا سال ایک ہی چھوٹے سے جزیرے میں یکہ و تنہا زندگی بسر کرنا پڑی ہے۔ وہاں انہیں جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے غذا تو کافی مقدار میں ملی اور دیکھنے کو مناظر بھی میسر آئے لیکن تنہائی اور بوریت کے احساس نے انہیں کچل کر رکھ دیا۔ اس بوریت ہی کا مقابلہ کرنے کے لئے جہاز کے جہاندیدہ کپتان نے مجھے اپنے ساتھ تین کتابیں لے جانے کا مشورہ دیا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ کتاب تو دوست کی طرح ہے۔ اگر دوست کم آمیز اور اس کی شخصیت اکہری ہے تو میں چند ہی ساعتوں میں اس سے اُکتا سکتا ہوں۔ اسی طرح میں ہر اس کتاب سے اُکتا سکتا ہوں جو مجھے سوچ کی غذا مہیا نہ کر سکے اور جس کے مطالعہ سے مجھے ہر بار ایک نئے بُعد کا احساس نہ ہو۔ نہ جانے مجھے اپنے طویل قیام میں ان تینوں کتابوں کو کتنی بار پڑھنا ہوگا اور یہ نہ ہو کہ دوسری ہی بار کے مطالعہ سے میں ان سے اُکتا جاؤں اور انہیں پورے زور کے ساتھ سمندر میں پھینک دوں۔ کتابیں کئی قسم کی ہیں۔ بعض ایک بار کے مطالعہ کے بعد ہی باسی ہو جاتی ہیں۔ بعض سو بار مطالعہ کرنے کے بعد بھی تازہ محسوس ہوتی ہیں۔ سائرن دوسری بار چیخا ہے اور جہاز سربسجود ہونے لگا ہے۔ وقت کچھ اور بھی تنگ ہے۔ میں نے یکے بعد دیگرے کئی کتابوں کو اٹھا کر دیکھا ہے اور پھر سر کو انکار میں ہلاتے ہوئے انہیں ایک طرف رکھ دیا ہے۔ مثلاً میری نظر لورین ایزلے کی کتاب — (THE IMMENSE JOURNEY) پر پڑی ہے اور میں نے جلدی سے یہ کتاب اٹھالی ہے —————— اب میں دوبارہ کتابوں کو الٹنے پلٹنے لگا ہوں۔

ایک چھوٹی سی کتاب شیلف میں سے پھدک کر زمین پر آگری ہے۔ میں نے کتاب کو

اٹھا کر دیکھا ہے۔ یہ نطشے کی "THUS SPAKE ZARATHUSTRA" ہے۔ میں نے خوش ہو کر یہ کتاب بھی اپنے تھیلے میں ڈال لی ہے۔ اب مجھے ایک، فقط ایک کتاب اور چاہیئے۔ شیلف میں سے۔ میر، غالب، میراجی، فیض اور ان کے مقلدین مجھے گھورنے لگے ہیں۔ مگر میں ان سے نظریں ملانا نہیں چاہتا۔ ییٹس، کیٹس اور ایلیٹ نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی ہے مگر فی الحال مجھے ان کی بھی ضرورت نہیں۔ ملارمے۔ سیفو۔ ملٹن۔ میرا بائی اور وارث شاہ۔ نہیں مجھے تو ایک ایسی کتاب چاہیئے جس میں سمندر کی سی وسعت، جنگل کی سی بوقلمونی اور شہر کی سی ہماہمی ہو۔ معاً میری نظر وہٹ مین (WHIT MAN) کی کتاب (LEAVES OF GRASS) پر پڑتی ہے اور میں اس کتاب کو بھی اپنے تھیلے میں ڈال لیتا ہوں۔ اب جہاز کچھ اور بھی جھک گیا ہے۔ میں اپنی لائف بوٹ میں آجاتا ہوں اور جہاز سے دور ہونے لگتا ہوں۔ پھر میں فاصلے سے دیکھتا ہوں کہ عرشے پر جہاز کا کپتان ایک سنگ میل کی طرح ایستادہ ہے اور لمحہ بہ لمحہ جہاز کے ساتھ ہی سمندر میں اُترتا جا رہا ہے۔ مگر میں اپنے جسم کی لائف بوٹ میں محفوظ تین انوکھی کتابوں کو سینے سے لگائے ایک بالکل نئے بُعد میں آگیا ہوں۔ اور اب اس قابل ہوں کہ جزیرے میں رہوں اور اس بوریت کو اپنے قریب بھی نہ آنے دوں جو جزیرے کے ہر مسافر کا نوشتہ تقدیر ہے۔

اور اب کہ میں جزیرے میں پہنچ گیا ہوں تو میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ میں نے سینکڑوں کتابوں میں سے ان تین کتابوں کا انتخاب کیوں کیا۔ اِن میں سے دو کتابیں تو بالکل مختصر سی ہیں مگر تیسری کتاب قدرے بڑی ہے۔ تاہم اس اعتبار سے یہ تینوں کتابیں بڑی ہیں کہ انہیں صفحوں کے حساب سے نہیں بلکہ فقروں، مصرعوں یا لفظوں کے حساب سے

پڑھنا چاہیئے۔

میں نے سب سے پہلے لورین ایزلے کی کتاب (THE IMMENSE JOURNEY) کو اپنے ہاتھ لیا ہے اور مغا میں جزیرے کی فضا کو عبور کر کے ماضی اور مستقبل میں دُور دُور تک گھومنے لگا ہوں۔ کئی منٹ تو میں اس کتاب کے عنوان ہی کو بار بار پڑھتا چلا گیا ہوں۔ عظیم سفر! THE IMMENSE JOURNEY لیکن کیسا سفر؟ یہ کوئی مہماتی کہانی نہیں جو خزانے کی تلاش سے متعلق ہو۔ یہ تو کہانی ہے زندگی کے سفر کی جو قرنوں پہلے شروع ہوا اور قرنوں بعد ختم ہوگا۔ لورین ایزلے ایک سائنس دان ہے لیکن وہ سائنس دان بننے سے پہلے ایک شاعر تھا۔ سائنس دان عملی آدمی ہوتا ہے۔ وہ حقائق کی روشنی میں ہر شے کا تجزیہ کرتا ہے اور پھر کسی اور مسئلہ کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے لیکن جب شاعر پر کوئی بات منکشف ہوتی ہے تو اس کا تخیل برانگیخت ہو جاتا ہے۔ یہی اس کتاب کا امتیازی وصف ہے کہ اس میں ایک شاعر نے سائنس دان کا رُوپ دھار کر درشن دیا ہے یا شاید اصل بات یہ ہے کہ ایک سائنس دان نے شاعر کے تخیل کو بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنی بیوی کی موت پر کچھ اس طرح کے تاثر کا اظہار کیا تھا کہ "میں نجانے کب سے ایک شاہراہ پر اکیلا چلا جا رہا تھا کہ وہ ایک پگڈنڈی پر سے کود کر شاہراہ پر آ گئی اور میرا ہاتھ تھام کر میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ وہ چلتی گئی چلتی گئی اور پھر ایک جگہ اس نے آہستہ سے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور شاہراہ سے پھوٹنے والی ایک اور گرد آلود پگڈنڈی پر مُڑ گئی۔ مگر میں آگے ہی آگے چلتا رہا۔" لورین ایزلے نے زندگی کے سفر کو بھی کچھ ایسے ہی دیکھا ہے۔ زندگی سمندر سے برآمد ہوئی اور پھر نباتات حیوانات اور پرندوں کی صورت میں مصروف سفر ہوئی اور لاکھوں کروڑوں برس

تک کروٹ پر کروٹ لیتی چلی گئی، مگر پھر آج سے محض چند لاکھ سال پہلے انسان بھی اس کارواں میں شامل ہو گیا۔ زندگی کا سفر جاری ہے۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ انسان کب اس کارواں سے کٹ کر دوبارہ اس تاریکی میں چلا جائے جہاں سے وہ برآمد ہوا تھا اور زندگی شادیانے بجاتی ہوئی آگے ہی آگے کو بڑھتی چلی جائے۔ لورین ایزلے لکھتا ہے کہ جب میں صبح کے جھٹپٹے میں بیدار ہوتا ہوں اور نیویارک کی کسی بلند و بالا عمارت کی چھت پر سے پرندوں کی چہکار کو سنتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے پرندے ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں۔ "کیا وہ (انسان) ابھی گیا نہیں؟"۔ میں لورین ایزلے کے اس ایک فقرے پر گھنٹوں سر دھن سکتا ہوں۔ انسان کو اس دنیا میں وارد ہوئے ابھی عرصہ ہی کتنا گزرا ہے لہٰذا وہ یہاں کے چرند پرند کے لئے قطعاً اجنبی اور غیر ارضی ہے تاہم اس نے زندگی کے لاتعداد دوسرے نمائندوں کو اپنا مطیع کر لیا ہے اور اب یہ نمائندے اس اجنبی تسلط سے اُکتا کر سوچتے ہیں کہ نجانے وہ کب دفع ہو گا؟ میں سوچنے لگا ہوں کہ یہ کرۂ ارض کروڑوں برسوں تک زندگی کے بغیر ہی خلا میں گھومتا رہا۔ پھر کروڑوں برس ہوئے اس پر زندگی نے اپنا گھونسلا بنایا (سائنس دان اس واقعہ کو اپنی بے رحم حقیقت نگاری کے تحت یوں بیان کرتے ہیں کہ لامحدود کائنات میں آوارہ پھرتے ہوئے اس کنکر پر جیسے ہم زمین کہتے ہیں زندگی کا (FUNGUS) سالگ گیا) ابھی صرف چند سال ہوئے کہ انسان پیدا ہوا۔ آنے والے زمانے میں یہ اجنبی شاید سب سے پہلے رخصت ہو گا، پھر چرند پرند جائیں گے۔ پھر حشرات الارض، پھر نباتات اور زمین دوبارہ کسی اندھی، گونگی اور ٹھنڈی شے کی طرح خلا میں کروڑوں اربوں برس تک گھومتی چلی جائے گی۔ لورین ایزلے پوچھتا ہے: "یہ زندگی" کہاں سے آئی؟ کیوں کہ

جب اس کے عناصرِ ترکیبی کو الگ الگ کر کے دیکھیں تو بظاہر ان میں کوئی راز نظر نہیں آتا۔ مگر محض ان عناصر کو ایک جگہ ڈھیر کر دینے سے زندگی پیدا بھی تو نہیں ہوتی۔ مختصر ترین سیل CELL میں بھی کم و بیش تین لاکھ PROTEN MOLECULES ہیں جو ایک خاص ترتیب سے منسلک اور مربوط ہوں تو زندگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ ترتیب کیا ہے؟ اس ترتیب کا محرّکِ اعظم کون ہے؟ کیا مادہ اور اس کا سارا پُراسرار نظام اور اس کے جُملہ حیرت انگیز مظاہر، جھینگر اور چڑیاں اور آوارہ پھرتے ہوئے انسان بجائے خود کسی انوکھی قوت کے چہرے کے مختلف نقاب نہیں ہیں؟ میں نے ایزلے کی کتاب لحظہ بھر کے لئے بند کر دی ہے اور سوچنے لگا ہوں کہ کیا زندگی محض اس کرۂ ارض تک محدود ہے؟۔ ہرگز نہیں! کائنات میں لاکھوں کروڑوں کہکشائیں موجود ہیں۔ ہر کہکشاں میں لاکھوں ستارے ہیں اور ہر ستارے کے گرد ایک خاص تعداد میں سیارے ہیں۔ ان سیاروں میں سے کسی بھی سیارے پر زندگی کی نمو ممکن ہے۔ مگر چونکہ زندگی کا امتیازی وصف تنوّع اور بوقلمونی ہے اس لئے کہیں یہ تو نہیں کہ کائنات میں زندگی کے لاکھوں کروڑوں روپ تو ہوں لیکن انسانی روپ کہیں اور موجود نہ ہو؟ تو پھر کیا ہم اس بھری کائنات میں اکیلے ہیں؟۔ معاً مجھے جزیرے میں اپنی تنہائی بے معنی نظر آنے لگی ہے کیوں کہ اب مجھ پر یہ بات منکشف ہوئی ہے کہ انسان تو بھری کائنات میں تنہا ہے۔

میں نے کتاب دوبارہ کھول لی ہے اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا ہوں۔ معاً میری نظریں لورین ایزلے کے اس ایک فقرے پر رُک جاتی ہیں۔

THE CLOCK IN THE BODY, IN OTHER WORDS, HAS PLACED A LIMIT UPON THE PACE AT WHICH THE APE

BRAIN GROWS— A LIMIT WHICH THE HUMAN ANCESTORS IN SOME MANNER ESCAPED.

اور یہ نقرہ میرے ذہن میں ایک ہیجان سا برپا کر دیتا ہے۔ زندگی کے ہر مظہر کے اندر اس کی ایک اپنی گھڑی (کلاک) موجود ہے، جو ایک مقررہ رفتار سے ٹِک ٹِک کرتی چلی جاتی ہے۔ ہر مظہر اپنی کلاک کی ٹِک ٹِک کا اسیر ہے۔ انسان صرف اس لئے انسان ہے کہ ارتقاء کے کسی موڑ پر اس نے APE کی کلاک کے زندان سے جست بھری اور ایک نئی کلاک کے زندان میں آگیا۔ اسی لئے (MISSING LINK) کی تلاش بے سود ہے۔ انسانی دماغ کی نمود آہستہ آہستہ بتدریج نہیں بلکہ ایک جست کے ذریعہ ہوئی۔ کئی برس ہوئے میں نے ایک کتاب لکھی تھی "تخلیقی عمل"! اس میں ایک بنیادی نکتہ یہ تھا کہ تخلیق کا عمل ایک پُراسرار سی جست کے تابع ہے! یہ جست جسم، معاشرہ تاریخ، دیومالا، فن، بلکہ ساری کائنات میں دیکھی جا سکتی ہے۔ آج جب میں نے ایرلے کی کتاب کو دوبارہ ہاتھ میں لیا تو مجھے اس جست کا ایک سائنسی ثبوت بھی مل گیا مگر اس کتاب سے مجھے اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ملا ہے۔ مثلاً یہ خیال کہ حیوان کے اندر کی گھڑی انسان کی گھڑی سے مختلف ہے اور انسان اور حیوان کی گھڑیاں نباتات کی گھڑی سے مختلف ہیں۔ جو گھڑی آہستہ چلتی ہے وہ زیادہ دیر تک چلتی ہے اور جو زیادہ تیز چلتی ہے وہ جلد ہی اپنے انجام کو پہنچ کر رُک جاتی ہے۔ اب کھُلا کہ پرانے زمانے میں عمریں کیوں لمبی ہوتی تھیں۔ اُن دنوں معاشرے کے کلاک کی رفتار وہ نہیں تھی جو بیسویں صدی میں ہو گئی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ میری زمین کی گھڑی بھی تو دوسرے سیاروں کی گھڑیوں سے مختلف ہے اور اسی لئے میری زمین کے وقت کا پیمانہ بھی

دوسرے سیاروں کے وقت کے پیمانوں سے مختلف ہے۔ پھر میری کہکشاں کی گھڑی ہے جس کی رفتار دوسری کہکشاؤں سے مختلف ہے۔ میں کس قسم کی کائنات کا باسی ہوں اُوپر دیکھوں تو وقت کی پرتیں تاحدِ خیال پھیلی ہیں اور یہ وقت سُست سے سُست تر ہوتا چلا گیا ہے (جیسے مثلاً ایک ستارے کا عرصۂ حیات جو کروڑوں روشنی کے سالوں پر محیط ہے) نیچے دیکھوں تو بھی وقت کی پرتیں تاحدِ خیال ہیں۔ مگر یہ وقت تیز سے تیز تر ہو رہا ہے (جیسے مثلاً وائرس (VIRUS) کی عمرِ طبعی، جو پلک جھپکنے میں ختم ہو جاتی ہے) میں خود وقت کی لاتعداد پرتوں میں سے صرف ایک پرت کا باسی ہوں۔ یہ کیسا زندان ہے! وقت کی لاکھوں منزلہ عمارت کی صرف ایک منزل میں رہنا وہیں پیدا ہونا اور وہیں عمرِ عزیز ایک خاص رفتار کی گھڑی کے تحت گزار کر چپکے سے رُخصت ہو جانا! لورین ایزلے کی کتاب کا یہ کرشمہ ہے کہ اس کے ایک ہی فقرے نے میرے ذہن میں اتنا بڑا ہیجان پیدا کر دیا ہے۔ میں نے اسی لئے یہ کتاب چنی تھی کہ میں اس کی معیت میں ساری عمر گزار سکتا ہوں۔

جزیرے میں یکہ و تنہا زندگی بسر کرنا صدیوں پرانے بن باس ہی کی ایک صورت ہے جب میں نے جہاز کو چھوڑا تو گوتم سدھیارتھ کی طرح گویا کپل وستو کو الوداع کہی اور بن باس اختیار کیا۔ میں اپنے اس گھر میں بہت محفوظ تھا۔ اس لئے کہ میری ذات معاشرے سے پوری طرح جُڑی ہوئی تھی اور میرے لئے سخت سے سخت سمندری ہچکولوں میں بھی جہاز سے نیچے گرنے کا کوئی خطرہ نہ تھا لیکن جب میں نے جہاز کو چھوڑا تو گویا اپنے معاشرے اور اس کے پُرپیچ دھاگوں سے کٹ کر یکایک بالکل اکیلا ہو گیا پہلے تو مجھے بڑا خوف محسوس ہوا کیوں کہ میں اب بھری کائنات میں تنہا تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ میرے اندر یہ احساس

جاگا کہ میں نے اپنے شانوں پر معاشرے کا کتنا بڑا بوجھ اٹھا رکھا تھا۔ اور میری شخصیت کس طرح اِس بوجھ تلے پِس کر رہ گئی تھی۔ شاید اسی لئے حساس اذہان خود کو پہچاننے کے لئے ہمیشہ شہر کو چھوڑ کر غاروں، صحراؤں اور پہاڑوں کی طرف بھاگتے رہے ہیں وجہ یہ کہ شہر اور اس کی مخلوق فرد کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ معاشرہ نہیں چاہتا کہ کوئی بھیڑ اُس کے گلّے سے الگ ہو کر بھٹک جائے۔ اسی لئے وہ اخلاقی ضوابط، سماجی قوانین روایت اور اصول اور قاعدہ اور ڈسپلن کی ڈور سے اُسے اس طور جکڑ لیتا ہے کہ وہ پھر کبھی اس جال سے باہر نہیں جا سکتا۔ مگر اس سارے حزم و احتیاط کے باوجود وہ اُن لوگوں کو نہیں روک سکا جو اُسے خیرباد کہہ کر بار بار جزیروں اور پہاڑوں اور صحراؤں کی طرف جاتے رہے ہیں۔ نطشے انہیں لوگوں میں سے ایک تھا۔ اس کا "برزیہ" سطح سمندر سے چھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع تھا جہاں اس نے اہرام مصر ایسی ایک بلند و بالا چٹان کے پاس بیٹھ کر کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھا " انسان اور وقت سے چھ ہزار فٹ دُور"! اور پھر تنہائی اور آزادی کے اس مقدس لمحے میں اپنی ذات سے پہلی بار متعارف ہوا۔ اُس نے ذات کے اس نئے رُوپ کو زرتشت کا نام دیا اور اس کے ہونٹوں سے ٹپکتے ہوئے ہر لفظ کو اپنی کتاب THUS SPAKE ZARATHUSTRA میں محفوظ کرتا چلا گیا۔ آج یہ کتاب میرے ہاتھ میں ہے اور میں انبوہ کی کلبلاہٹ سے دُور اپنی ہی ذات کی معیت میں بیٹھا اس کا دلجمعی سے مطالعہ کر سکتا ہوں۔

نطشے اکثریت کا نہیں اقلیت کا قائل ہے۔ گلّے کا نہیں گلّے بان کا والہ و شیدا ہے۔ اور وہ بنی نوع انسان کو نہیں بلکہ مردِ مومن کو اپنی منزل قرار دیتا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس کا یہ نظریہ آمریت کی طرف ایک قدم تھا بلکہ اس نے تو فرد کو اجتماع

کی اس اکثریت سے بچانے کی کوشش کی جس نے یورپ کو اپنے پنجوں میں دبوچ رکھا تھا۔ ارتقاء غزال کی طرح چوکڑیاں بھرنے کا نام ہے نہ کہ بھیڑ کی طرح نپے تُلے قدم اٹھانے کا اور یہ چوکڑی ہمیشہ کوئی ایسا مردِ قلندر بھرتا ہے جو بہرا عتبار اپنی نوع سے افضل ہوتا ہے۔ یوں دیکھئے تو نطشے نہ تو طاغوتی قوت کا علم بردار ہے اور نہ وہ مردم بیزاری کا مرتکب ہوتا ہے۔ وہ تو پرانے زنگ آلود جہان کو ایک دھماکے کے ساتھ اڑانے اور اس کے بعد ایک ایسے جہانِ نو کو وجود میں لانے کا داعی ہے، جس میں خیر و شر کی جملہ سابقہ توضیحات ختم ہو جائیں گی اور ایک نئی اخلاقیات کا سورج طلوع ہوگا۔

جزیرے میں رہتے ہوئے مجھے یہ احساس بار بار کچوکے لگاتا ہے کہ میں ساری دُنیا سے کٹ گیا ہوں۔ ایسے میں یہ کتاب مجھے اتنا اُونچا اٹھا لیتی ہے کہ سمندر کے اس پار کی زمینیں تک میری نگاہ کی دسترس میں آجاتی ہے اور مجھے سارا معاشرہ اپنے قدموں میں کلبلاتا ہوا دکھائی دینے لگتا ہے۔ تنہائی کا مقابلہ کرنے کا ایک یہ بھی طریق ہے اور یہ طریق مجھے نطشے کی اس کتاب ہی سے ملا ہے۔ تجدید ملاقات کے لئے میں کتاب کی ورق گردانی کرتا ہوں اور میری نظریں ان الفاظ پر آکر رُک جاتی ہیں،

اور وہ بھی ہیں
جو بھاری قدموں کے ساتھ چلتے ہیں
اُن چھکڑوں کی طرح
جو پتھروں سے لدے ہوئے نشیب کی طرف لڑھک رہے ہوں
یہ لوگ زور شور سے عزت اور تمکنت اور اچھائی کی باتیں کرتے ہیں
اور اپنے (پتھریلے) بوجھ کو خیر کا نام دیتے ہیں۔

اور وہ بھی ہیں

جو چاہتے ہیں کہ انہیں آسمان پر چڑھا دیا جائے

اور وہ اسے خیر کا نام دیں

اور وہ بھی ہیں

جو چاہتے ہیں کہ انہیں پاتال میں گرا دیا جائے

اور وہ اس بات کو بھی خیر ہی کہہ کر پکاریں

نطشے کے سامنے سارا انسانی معاشرہ اور اس کی اخلاقیات پیاز کی طرح ہے جس کی پرتوں کو وہ ایک ایک کر کے اتارتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ آخر میں اُسے صدف کے اندر کا "موتی" ملے گا۔ بلکہ شاید یہ بتانے کے لئے کہ پیاز پرتوں اور نقابوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ جزیرے میں رہتے ہوئے پرتوں کے اُترنے کا منظر مجھے ایک عجیب سی روحانی بالیدگی عطا کرتا ہے جیسے گویا میں زندگی کو پہلی بار اس کی اصل صورت میں دیکھ رہا ہوں۔

میں نے کتاب کی مزید ورق گردانی کی ہے اور کہیں کہیں سے کوئی حصہ پڑھتا ہوں:

جب سے انسانیت وجود میں آئی ہے

انسان نے بہت کم مسرت کو چکھا ہے

بھائیو! یہی تو ہمارا پہلا گناہ ہے

لوگوں کے درمیان رہنا مشکل ہے

اس لئے کہ چُپ رہنا مشکل ہے

ہم دونوں ایک بڑے دروازے میں رُک گئے
میں نے کہا۔" بونے! اس دروازے کو دیکھ کہ اس کے دو چہرے ہیں
یہاں دو سڑکیں آکر ملتی ہیں
یہ پیچھے کی طرف جاتی ہوئی سڑک جو ازل تک چلی گئی ہے
اور وہ آگے کو بڑھتی ہوئی سڑک جو ابد تک جاتی ہے
یہ سڑکیں ایک دوسری کی "نفی" ہیں
مگر وہ اس دروازے پر یکجا ہو گئی ہیں
اور دروازے کی پیشانی پر لکھا ہے ۔"لمحۂ حال"
بونے! کیا ہم ان سڑکوں پر آگے ہی آگے بڑھتے جائیں؟
کیا سڑکیں اسی طرح ازلی و ابدی طور پر رواں ہیں؟"
اور بونے نے تحقیر کے ساتھ کہا:
"ہر سیدھی شے فریبِ نظر ہے
ہر سچائی مُڑی ہوئی ہے
وقت بجائے خود ایک دائرہ ہے"

میرے لئے اِس کتاب کا ہر فقرہ ایک جہانِ معنی کا صدر دروازہ ہے۔ میں اس دروازے میں سے اندر کی کائنات کی ایک جھلک پاتا ہوں اور پھر اس تجلّی کی تاب نہ لاکر گھنٹوں ایک دائرۂ نور میں گرفتار رہتا ہوں۔ یوں وقت گزرتا چلا جاتا ہے۔

ابتدا میں یہ زمین بالکل بنجر تھی۔ ایک طرف پانی کا بیابان تھا۔ دوسری طرف خشکی کا بیابان پھر پانی کے بیابان میں زندگی کی کُلبلاہٹ سی ہوئی اور وہ کروڑوں برس تک اپنے اس

INCUBATOR میں پلتی پھولتی چلی گئی۔ پھر ایک روز زندگی نے پانی کے شفاف گھونگھٹ کو اپنے چہرے سے ہٹایا تو اُسے خشکی کا بیابان دکھائی دیا اور وہ ایک چور کی طرح اس پر دبے پاؤں رینگنے لگی۔ یہ سلسلہ بھی لاکھوں برس جاری رہا۔ پھر یکایک نجانے کیا ہوا کہ کسی نے صورِ اسرافیل پھونکا اور بنجر بے رنگ زمین پر گھاس کی سبز چادر بچھ گئی اور انگنت رنگوں کے پھول ساری زمین کو ڈھانپنے لگے۔ پھر گھاس کی اس چادر پر انسان کے جدِ امجد نے ڈرتے ڈرتے اپنا پہلا قدم رکھا اور اس گھاس ہی کے ایک خوشے سے کچھ بیج نکال کر کھائے۔ یُوں اُس نے بصارت بھی حاصل کی اور بصیرت بھی۔ وہ دن اور آج کا دن، گھاس اور انسان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ انسانی معاشرہ بھی گھاس ہی کی طرح ہے۔ ذرا نم ہو تو یہ پھُول اور پتیاں اس فراوانی سے نکالتا ہے کہ مالتھس کی روح بھی کانپ اٹھتی ہے۔ پھر گھاس کا ایک اور وصف یہ ہے کہ اگر آپ اس پر درانتی چلائیں یا ویسے ہی اپنے ڈھور ڈنگروں کی خدمات سے فائدہ اٹھا کر اسے صاف کر دیں تو ایک معیّن عرصہ کے بعد یہ دوبارہ زمین کے اندر سے برآمد ہو جاتی ہے۔ یہی حال انسانی معاشرے کا ہے۔ موت کی درانتی ایک پوری نسل پر چل جاتی ہے تو ایک نئی نسل کی سبز پتیاں باہر نکل کر ساری زمین کو دوبارہ ڈھانپ لیتی اور معاشرے کو ایک بار پھر سرسبز کر دیتی ہیں والٹ وہٹ مین انہی سرسبز پتیوں کا شاعر ہے۔ اُس نے نسلوں اور موسموں کی آمد و رفت کو دیکھا ہے۔ حدِ نظر تک پھیلی ہوئی زمین اور حدِ خیال تک پھیلی ہوئی ستاروں کی گزرگاہ کو دیکھا ہے اور اُس کے احساس کے اُفق پر خدا، انسان اور فطرت کی تثلیث اُبھر آئی ہے مگر اس نے ان تینوں کو اس طور مربوط کر دیا ہے کہ ساری کائنات اکائی میں ڈھل گئی ہے۔ یہ کام ایک ایسا حساس شخص ہی کر سکتا تھا جس نے ایک وسیع و کشادہ فضا اور

ایک محفوظ معاشرے میں جنم لیا ہو۔ مثل مشہور ہے کہ ہر انگریز ایک جزیرہ ہے اور ہر امریکی ایک برِ اعظم! بات کچھ ایسی غلط بھی نہیں انگریز اس لئے ایک جزیرہ ہے کہ وہ کٹا ہوا، الگ تھلگ اور کم آمیز ہے اس قدر کہ ٹرین میں سفر کرتے ہوئے بھی وہ اپنے اور دوسرے مسافروں کے درمیان اخبار کی ایک کھڑکھڑاتی ہوئی دیوار کھڑی کر لیتا ہے اور بڑی مشکل سے گفتگو پر آمادہ ہوتا ہے۔ اُس نے اپنی سماجی زندگی میں بھی قانون اور قاعدہ، روایت اور رسم و رواج کے متعدد حصار قائم کر رکھے ہیں جو اُسے بیرونی اثرات سے محفوظ رکھتے ہیں۔ جب کہ امریکی مزاجاً ایک برِ اعظم کی طرح انجمن آرا اور گپ شپ کا رسیا ہے۔ اپنی اس عادت کے باعث وہ اکثر ہدفِ طنز بھی بنا ہے لیکن اس کے باوجود کم گوئی یا کم آمیزی کا مرتکب نہیں ہوا۔ اس اعتبار سے وہ برِ صغیر ہند و پاک کے باسیوں سے گہری مماثلت رکھتا ہے۔ دونوں زمین کی وسعت اور نسلوں کے اختلاط کی پیداوار ہیں اور اسی لئے اپنے اپنے معاشرے ہی سے نہیں سرحد پار کے معاشروں سے بھی جُڑے ہوئے ہیں۔ والٹ وہٹ مین اسی امریکی مزاج کا نمائندہ ہے۔ مگر وہ امریکہ کا کبیر بھی ہے کہ محبت کا قائل، سرزمینِ وطن کا عاشق اور روح کی لطافت کا اعلامیہ ہے۔

جزیرے میں رہتے ہوئے جہاں مجھے نطشے کی ضرورت ہے کہ وہ مجھے غوّاصی کی ترغیب دے یا بلندی پر سے اشیاء کو دیکھنے پر مائل کرے وہاں مجھے وہٹ مین کی بھی ضرورت ہے تاکہ وہ مجھے اپنی ہی ذات کی چکا چوند سے باہر لا کر اور زمین کی مسند پر اُتار کر، انسانوں کے جمِ غفیر کے احساسات سے روشناس کرائے۔ جب تک بدھ بڑ کے چھتنار تلے اپنی ہی ذات کی تجلی میں گرفتار رہا اس کی حیثیت الپس کی بلندی پر براجمان فریڈرک نطشے سے مختلف نہیں تھی لیکن جب وہ وہاں سے اُٹھ کر انسانوں کے درمیان

آگیا اور اس نے محبت مفاہمت، یکجائی اور ہم آہنگی کا درس دیا تو وہ گویا کبیر یا وہٹ مین کے روپ میں نمودار ہوا۔ سوچتا ہوں کہ نطشے اور وہٹ مین شگفتنِ ذات ہی کے دو مرحلے ہیں۔ ایک لمحہ کی تابندگی سے اکتسابِ نور کرتا ہے۔ دوسرا اس روشنی کو دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ ایک اظہار ہے تو دوسرا ترسیل! جزیرے میں رہتے ہوئے محض اظہار کی سطح پر زندہ رہنا ممکن نہیں اس لئے مجھے ترسیل کی سطح پر بھی اُترنا چاہیئے تاکہ میں اپنی مسرت اور دُکھ میں دوسروں کو بھی شریک کر سکوں یا دوسروں کی مسرت اور دُکھ میں خود بھی شریک ہو سکوں۔ مگر والٹ وہٹ مین محض امریکی برانڈ کی مسرت یا دُکھ تک خود کو محدود نہیں رکھتا۔ بسا اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ نسل، رنگ اور قوم کی حدود کو پار کر کے ساری نسلِ انسانی کے دُکھوں اور خوشیوں میں شریک ہے بلکہ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے وہ ساری کائنات میں پھیل گیا ہے۔ "گھاس کی پتیاں" میں "محبت بیک وقت قانونِ فطرت بھی ہے اور قانونِ خداوندی بھی" اور اس لئے یہ کرۂ ارض ہی پر نہیں ستاروں سے آگے کے جہانوں پر بھی کمند پھینکنے کی خود میں سکت اور ہمت رکھتی ہے:

اے روح

یہ وہ ساعتِ نایاب ہے جب تُو
کتاب، آرٹ، فن اور اس کے اسباق سے اُوپر اُٹھ کر
ایک بے نطق کائنات میں پرواز کر سکتی ہے
اور (اس پرواز کے دوران) تُو
ایک خاموش نووارد تماشائی کی طرح
اُن تمام باتوں پر غور کر سکتی ہے جو تجھے عزیز ہیں

یعنی رات، نیند، موت اور ستاروں (کی آبجو)

اے جوانی!

بڑی ہی مہربان تمکنت، توانائی اور کشش سے لبریز جوانی!

کیا تُو جانتی ہے؟

کہ تیرے بعد بڑھاپا بھی اسی کرّ و فر، توانائی اور کشش کے ساتھ نمودار ہوگا

(جیسے)

دِن، بھرپور، شاندار۔ آفتاب، حرکت آرزو اور قہقہے سے مزین دن

(اور اس کے بعد)

رات، لاکھوں ستاروں کی معیت میں

نیند اور تھکاوٹ کو دُور کرنے والی تاریکی کو اپنے (سینے کے) ساتھ لگائے ہوئے!

سفر! فوری سفر!

لہو میری شریانوں میں کھولنے لگا ہے

اے روح! لنگر کھول دے

رسیوں کو توڑ

بادبانوں کو کھول

کیا ہم یہاں درختوں کی طرح زمین میں گڑے ہوئے نہیں ہیں؟

کیا ہم یہاں حیوانوں کی طرح محض کھاتے اور اونگھتے نہیں رہے ہیں؟

کیا ہم نے یہاں کتابوں سے خود کو تاریک اور بے حس نہیں کر دیا؟

چنانچہ والٹ وہٹ مین کی کتاب مجھے اس لئے بھی پسند ہے کہ یہ مجھے جزیرے سے باہر نکلنے کی ترغیب دیتی ہے۔ ٹینی سن کے لوٹس ایٹرز نے اپنی تقدیر سے سمجھوتہ کر لیا تھا اور جزیرے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اونگھنے لگے تھے مگر وہٹ مین کے اندر جذبۂ سیاحت سدا بیدار رہتا ہے۔ ہر امریکی کی طرح اُس کے ہردے میں بھی کولمبس چھپا ہوا ہے جو اُسے نئی سرزمینوں کی تلاش پر اُکساتا ہے۔ میرے لئے جزیرے کے قیام کے دوران وہٹ مین کی معیت میں نئی نئی سرزمینوں کو دریافت کرنے کی مہم ایک ایسا خوشگوار تجربہ ہے جس سے میں کبھی اُکتا نہیں سکتا۔ اس کی ہمراہی مجھے اس لئے بھی عزیز ہے کہ وہ زندگی کی شاہراہ پر سفر کرتے ہوئے گھاس کی ہر پتی، درخت کی ہر شاخ، پہاڑ کے ہر خم اور سمندر کی ہر موج میں دلچسپی لے سکتا ہے اور پھر مجھے زمین سے اُوپر اٹھا کر ایک ایسا منظر بھی دکھا سکتا ہے جس میں شاخیں، پتیاں، موجیں اور خمِ زندگی کے ایک ہی وسیع و بے کنار جزر و مد میں پوری طرح ضم ہو چکے ہیں۔ آگے بڑھ کر جزو کو مرکزِ نگاہ بنانا اور پھر پیچھے ہٹ کر اُس سارے پس منظر کو دائرۂ نگاہ میں سمیٹ لینا جس میں جزو محض ایک موہوم سا نقطہ ہے، بس یہی والٹ وہٹ مین کے موویٔ کیمرے کا کمال ہے اور یہی اس کا کمالِ فن بھی ہے۔

اور اب کہ جزیرے میں رہتے ہوئے مجھے ایک عرصہ ہو گیا ہے، میں محسوس کرنے لگا ہوں کہ جزیرے کا یہ باغِ بہشت ایک زندان سے مختلف نہیں۔ زندان کیوں کہ انسان دُکھ کی قید ہی سے نہیں مسرت کی قید سے بھی اُکتا سکتا ہے (انسان کے جدِ امجد کا باغِ بہشت سے باہر آنا اب سمجھ میں آیا ہے) میں بھی اس جزیرے (ذات کے اس بندی خانے) سے باہر نکلنے کا آرزو مند ہوں۔ اس کے لئے میں تمام عرصہ چپکے چپکے ایک کشتی تیار

کرتا رہا ہوں جسے چلانے کے لئے میں نے تین ملاحوں کی خدمات بھی حاصل کرلی ہیں
اگر یہ ملاح آپس میں دست وگریبان نہ ہو گئے یا میں اُن سے لڑ نہ پڑا تو آپ
دیکھیں گے کہ میں آئندہ برس تک اُس سرزمین کو ضرور تلاش کرلوں گا، جہاں سے میں
نے اپنے سمندری سفر کا آغاز کیا تھا اور جہاں میرے عزیز و اقارب اور دوست احباب
ایک زمانے سے میری واپسی کے منتظر ہیں.

اکلاپا اور تنہائی

میں اپنی زندگی میں جب کبھی اکلاپے[1] کی زد میں آیا ہوں تو خلقِ خدا نے مجھے آفت زدہ علاقہ قرار دے ڈالا ہے۔ خود میں نے یہ محسوس کیا ہے جیسے میں کسی چھوت کی بیماری میں مُبتلا ہو گیا ہوں۔ اور میرے عزیز ترین دوست بھی مجھ سے دُور بھاگ رہے ہیں ؎

آفت رسیدہ دوست بھی آفت سے کم نہیں
اے دوست الحذر کہ میں آفت رسیدہ ہوں

مگر اکلاپے کے روگ میں شخص ہی نہیں کبھی کبھی پوری قوم بھی مبتلا ہو جاتی ہے اور زندگی کے دھارے سے کٹ کر کسی اندھے گڑھے میں جا گرتی ہے۔ دوسری طرف تنہائی[2] ایک امرت ہے جو اکلاپے کے کرب کو مٹاتا اور زندگی کی نبض کو اعتدال پر لاتا ہے۔ اکلاپا چاہِ یوسفؑ کی گھٹن ہے مگر تنہائی دیدۂ یعقوبؑ سے قطرہ قطرہ ٹپکتی ہوئی وہ محبت جو اپنے تازہ لعاب سے تمام ٹوٹے ہوئے دھاگوں کو جوڑ دیتی ہے۔ اکلاپا توڑتا ہے، منزل و گام میں فراق کی دُھند پھیلاتا ہے، سمتوں سے بے نیاز

---

[1] LONELINESS [2] SOLITUDE

کرتا ہے۔ مگر تنہائی جوڑتی ہے خاک و افلاک میں آمد و رفت کے سارے سلسلوں کو بحال کرتی ہے اور کڑے فاصلوں کو چشم زدن میں عبور کر جاتی ہے۔

یہ سارے "اقوالِ زرّیں" میں نے اپنے تجربات سے کشید کئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ میری زندگی میں گاہے گاہے ایسے لمحات بھی آئے ہیں جب میں بھری دنیا میں بالکل اکیلا رہ گیا ہوں اور ایسے بھی جب میں ایک نقطے سے پھیل کر پوری کائنات پر محیط ہونے لگا ہوں۔ جب میں اکیلا ہوا ہوں تو مجھے یُوں لگا ہے جیسے میرے دوست دشمن، اپنے بیگانے، خوشیاں اور غم، یہ سب کسی فرسودہ پیرہن کی دھجیوں کی طرح میرے بدن پر سے اُترتے چلے گئے ہیں اور میرے پاس کچھ بھی باقی نہیں رہا، جیسے ہر شخص مجھ سے کترا رہا ہے۔ میں ٹوٹتے ہوئے رشتوں کو سنبھالا دینے کی کوشش کرتا ہوں مگر دامن کی ایک دھجی کے سوا میرے ہاتھ کچھ نہیں لگتا اور دوسرے ہی لمحے یہ دھجی بھی ہَوا ہو جاتی ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں ایک بدوضع کنکر کی طرح زندگی کے تالاب میں آگرا ہوں اور زیرِ سطح سوئی ہوئی لہریں ہڑبڑا کر بیدار ہو گئی ہیں اور پھر مجھے دیکھتے ہی پاگلوں کی طرح دوڑتی ہوئی کناروں کی گھاس میں جا چھپی ہیں اور میں بالکل اکیلا رہ گیا ہوں۔

مگر یہ تو اکلاپے کی بات ہوئی۔ تنہائی کا معاملہ اس سے بالکل جُدا ہے۔ وہ اکلاپے کی طرح آپ پر کہیں باہر سے حملہ زن نہیں ہوتی بلکہ اندر سے پھُوٹتی ہے۔ اکلاپا تو ایک حادثہ ہے۔ اگر آپ اس کی زد میں آگئے ہیں تو پھر آپ کے لئے دُعائے خیر ہی کی جا سکتی ہے۔ مگر تنہائی سینے کے اعماق میں جنم لیتی ہے۔ ایک پودے کی طرح اُگتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک تناور درخت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اکلاپے کا روگ اس

بات میں ہے کہ اِرد گرد کا ماحول آپ سے گفتگو کا سارا سلسلہ ہی ختم کر دیتا ہے۔ تنہائی کی خوبی یہ ہے کہ اس میں مبتلا ہو کر آپ اِرد گرد کے ماحول سے دوبارہ مصروفِ گفتگو ہو جاتے ہیں۔ اکلاپے کے انقطاع میں اکہرا پن ہے مگر تنہائی قلبِ ماہیت کی ایک صورت ہے کہ یہ شخص کو گفتگو کی نچلی سطح سے اُوپر اُٹھا کر ہم کلامی کی ایک بلند سطح پر فائز کر دیتی ہے۔

میں یہاں تک ہی لکھ پایا تھا کہ معاً مجھے اپنے ماضی کی تاریکیوں میں ایک انوکھا واقعہ جگنو کی طرح چمکتا ہوا دکھائی دیا۔ یہ ان ایام کی بات ہے جب میں اپنے کالج کو الوداع کہہ کر ایک دُور افتادہ گاؤں میں ماندگی کے وقفے سے نبرد آزما ہو رہا تھا۔ میرے لئے کالج کا زمانہ ایک طویل اکلاپے کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں نہ تو میرا کوئی دوست بنا اور نہ میں نے کسی کو اپنا دوست بنایا۔ لیکن جب میں کالج کے بعد ایک طویل بیکاری کے کرب سے آشنا ہوا تو اکلاپے کا وہ احساس جو کالج کے ایام میں پروان چڑھا تھا کچھ اور بھی گہرا ہو گیا۔ اس وقت تک میرے ماضی میں کوئی ایسی سہانی کیفیت نہیں آئی تھی کہ جس کی یاد کا میں سہارا لے سکتا۔ مستقبل تاریک اور سپاٹ تھا اور حال اپنا منہ کھولے یوں کھڑا تھا جیسے مجھے نگل جانا چاہتا ہو۔ ایک عجیب سی بے بسی کا عالم تھا۔ میں گھنٹوں، پھر دنوں، کسی کٹے ہوئے پتنگ کی طرح ڈانواں ڈول پھرتا رہتا اور پھر یہ واقعہ رُونما ہوا۔ اس روز سہ پہر کے قریب گھٹا اُٹھی تھی اور آدھ گھنٹے کے اندر اندر جل تھل ہو گیا تھا۔ اچانک میں اپنے بدن پر سے غنودگی کی راکھ کو جھٹک کر اُٹھ کھڑا ہوا اور یوں ہی بے ارادہ کھیتوں میں نکل گیا۔ میں چلتا رہا، چلتا رہا، پہلے گاؤں کی کچی سڑکوں پر۔ پھر نجانے کب میں ایک پگڈنڈی پر ہو لیا جو آہستہ آہستہ ایک موہوم سی لکیر میں تبدیل

ہوتی چلی گئی۔ اس وقت تو مجھے معلوم نہ ہو سکا لیکن برسوں کی دُھند میں سے دیکھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ واقعہ کسی جھنکار کے ساتھ اچانک رُونما نہ ہوا بلکہ بڑی آہستگی سے ہَوا اور بادل اور آسمان اور بارش اور بارش میں بھیگے ہوئے درختوں اور پرندوں کے ذریعے ایک مجسّم کیفیت بن کر مجھ پر چھا گیا۔ چاروں طرف مکمّل سناٹا تھا۔ کوئی انسان دُور دُور تک موجود نہیں تھا۔ اُوپر ایک بیکراں آسمان تھا جس کے آنگن میں گول مٹول سے اَبر پارے بچّوں کی طرح کھیل رہے تھے۔ نیچے ایک سرسبز شاداب دھرتی تھی جس پر پرندے اور کیڑے اور شہد کی مکھیاں اور بھونرے ایک کبھی نہ ختم ہونے والی گرم گہری گفتگو میں مصروف تھے۔ پھر ایک احساس میرے اندر سے، اندر کی کسی بہت ہی تاریک گُپھا سے برآمد ہو کر مجھ پر چھا گیا۔ احساس یہ تھا کہ میں تنہا تو ہوں لیکن اکیلا نہیں ہوں اس لمحے سے قبل میں نے کبھی اپنے اِرد گرد کی اشیاء اور مظاہر کی زبان کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بلکہ مجھے تو اس زبان کو سُننے کا کبھی اتفاق تک نہیں ہوا تھا مگر اب مجھے محسوس ہوا کہ آسمان اور زمین اور ان دونوں کی آغوش میں سمٹی ہوئی ہر شے نجانے مجھے کب سے صدائیں دے رہی ہے۔ میری طرف اپنی باہیں پھیلائے ہُمک رہی ہے بلکہ مجھ پر خوشبوؤں اور کرنوں اور آوازوں کی بارش کر رہی ہے مگر میں ہوں کہ اکلاپے کے زندان میں قید اپنی ساری حسّیات کو مُہر بہ لب کئے ان تمام پیغامات سے یکسر بے نیاز ہوں۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ میں کُل سے کٹا ہوا کوئی جزو نہیں ہوں بلکہ ایک ایسا کُل ہوں جس کے حصّے بخرے ہو ہی نہیں سکتے۔ تب میں نے اپنے ماضی پر ایک نگاہ ڈالی جو مجھے آوازوں اور خوشبوؤں اور کرنوں کا ایک گجرا سا دکھائی دیا۔ یہ ہار تو ہمہ وقت میرے گلے میں پڑا تھا۔ میں اس کے وجود سے آشنا کیوں نہ ہو سکا؟ —

میں نے اپنے مستقبل پر ایک نگاہ ڈالی۔ حدِ نظر تک میری ذات سے نکلے ہوئے دھاگے روشنی کی شعاعوں کی طرح پھیلتے چلے گئے تھے۔ تو کیا میں لَو دینے لگا ہوں؟ معاً جیسے میں پوری کائنات کا چمکتا ہوا مرکزی نقطہ بن گیا تھا۔ ایک سورج جس کے گرد زندگی سیاروں میں ڈھل کر گھومنے لگی تھی۔ ایک عجیب سی گہما گہمی تھی۔ گرم گفتاری کے سلسلے دراز ہو گئے تھے۔ ایک پوری انجمن وجود میں آگئی تھی اور میں کہ جانِ انجمن تھا اپنے پورے بدن اور روح کے ساتھ ایک ایک چیز کو گلے لگا رہا تھا۔

اس واقعہ سے مجھ پر یہ بات منکشف ہوئی کہ اکلاپا اور تنہائی — دو بالکل مختلف کیفیات ہیں۔ ایک منفی ہے اور دوسری مثبت! ایک مجسّم کرب ہے اور دوسری مجسّم فرحت! مگر ساتھ ہی میں یہ بھی جان گیا کہ یہ دونوں ایک دوسری کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ میں ہر لحظہ کٹ بھی رہا ہوں اور جُڑ بھی رہا ہوں۔ اگر کٹ جانے کے کرب سے نہ گزروں تو پھر جُڑ جانے کی لذت سے آشنا ہی کیسے ہو سکتا ہوں!

سو اب صورت یہ ہے کہ میں جب محسوس کرتا ہوں کہ بوریت اور یکسانیت نے مجھے آلیا ہے تو اپنی ذات کے REMOTE CONTROL کو ذرا سا چھو لیتا ہوں اور چینل تبدیل ہو جاتا ہے۔ اکلاپے کی یک رنگی کے بجائے تنہائی کی ٹیکنیکلر دنیا میری نظروں کے سامنے اُبھر آتی ہے۔ چاروں اطراف سے گرم گرم پیغامات آنے لگتے ہیں۔ ہر شے مجھ سے ہم کلام ہونے کی آرزو میں سرشار ہو جاتی ہے۔ میرے اور میری دنیا کے درمیان دو طرفہ آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ایک شامِ دوستاں آباد ہو جاتی ہے اور میں کھِل اُٹھتا ہوں، جینے لگتا ہوں۔

اور اب تو میں اس کارگہِ شیشہ گری کا اتنا ماہر ہو گیا ہوں کہ جب زندگی کے

کسی موڑ پر کسی بور شخص سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ اپنی ہمہ دانی اور ہمہ بینی کا مظاہرہ کر کے مجھے اکلاپے کے سپرد کر دیتا ہے تو میں سوچ کو دبا کر سکرین سے آنے والی آواز کو بالکل مدھم کر دیتا ہوں۔ اس سے مجھے ایک عجیب سا سکون ملتا ہے۔ مجھے اس شخص کے ہونٹ کھلتے اور بند ہوتے، چہرے کے نقوش سمٹتے اور پھیلتے اور دو کمرہ سے ہاتھ ہوا میں لکیریں سی کھینچتے ہوئے تو دکھائی دیتے ہیں مگر آواز مطلق نہیں آتی۔ اس وقت مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ شخص اپنے پورے جسم کے ساتھ ایک خاموش رقص کر رہا ہے۔ کچھ دیر اس مضحکہ خیز صورتِ حال سے محظوظ ہونے کے بعد میں چینل ہی تبدیل کر دیتا ہوں۔ اب میرے لئے یہ شخص اپنی شخصیت سے دست کش ہو کر ماحول کی چادر پر محض ایک سلوٹ بن چکا ہے اور پورا ماحول ایک بالکل نئی سطح پر مجھ سے ہم کلام ہو رہا ہے۔ تنہائی انجمن آرائی کا صدر دروازہ ہے مگر یہ قطعاً ضروری نہیں کہ تنہائی حاصل کرنے کے لئے آپ کسی گوشۂ عافیت ہی کی تلاش کریں یا فطرت کی آغوش میں دبکے ہوئے کسی معطر کنج ہی کی طرف لپکیں۔ شعراء نے فطرت نوازی کے جذبے کے تحت خلقِ خدا کو یہ احساس دلانے کی کوشش بار بار کی ہے کہ اصلی اور خالص تنہائی صرف فطرت کی آغوش ہی میں مل سکتی ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ مہنگائی کے اس دور میں اپنا شہر چھوڑ کر اتنا طول طویل سفر کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ آپ بس یہ کریں کہ جب اگلی بار اکلاپے کا چینل آپ کے لئے سوہانِ روح بننے لگے تو REMOTECONTROL کو ذرا سا چھو کر تنہائی کے چینل کو سامنے لے آئیں، پھر آپ دیکھیں گے کہ اکلاپا آپ کے بدن پر سے یوں اُتر گیا ہے جیسے سانپ پر سے کینچلی!

میرا البم

بے ترتیبی پھیلانا ہمارا قومی مشغلہ ہے لیکن کبھی کبھی جب ہم بے ترتیبی پھیلاتے پھیلاتے بوریت سی محسوس کرنے لگتے ہیں تو منہ کا مزہ بدلنے کے لئے ترتیب اور قرینہ کی مہم شروع کر دیتے ہیں۔ یہ گویا ایک طرح کا ذہنی ضابطہ ہے جو عامل اور معمول کے میکانکی رشتے کو توڑ کر ایک طرحِ نو کا اہتمام کرتا ہے۔ ایک ایسے ہی ذہنی ضابطے کے تحت میں نے کل صبح اپنے پرانے کاغذات کی "صفائی" اور ترتیب کا ارادہ کیا اور ہر قسم کی بیرونی مداخلت سے بچنے کے لئے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے مقفل کر لیا۔ پھر میں کاغذات کے اُن ڈھیروں سے نبرد آزما ہو گیا جو پچھلے کئی برس سے آہستہ آہستہ فربہی کی طرف مائل ہوتے رہے تھے اور اب اچھے خاصے کاغذی پہاڑ بن چکے تھے۔ ان ڈھیروں میں کیا کچھ نہ تھا۔ اخباروں کے تراشے، تقاریب کے دعوت نامے، دوستوں کے خطوط، ادھوری نظمیں، نامکمل مضامین کے مسودے، ہوٹلوں کے بل رسیدیں اور نہ جانے کیا کیا کچھ۔ میں سوچنے لگا آخر میں نے یہ "سب کچھ" کیوں اکٹھا کر رکھا ہے کہ اب میرے لئے اس جنگل میں راستہ تلاش کرنا بھی ممکن نہیں رہا۔ مگر پھر مجھے خیال آیا کہ ان میں سے ہر چیز اپنے زمانے میں ضرور اہم ہو گی ورنہ میں اس سے بآسانی

پیچھا چھُڑا چُکا ہوتا یا ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ انسان کی ذات میں چھُپا ہوا طفلِ مادہ پرست اُسے اشیاء جمع کرنے کی ترغیب دیتا رہتا ہے اور پھر ایک روز یہ جمع شدہ اثاثہ اتنا وزنی ہو جاتا ہے کہ اس کے بوجھ تلے اس کا اپنا سانس بھی رُکنے لگتا ہے۔ بس جب بوجھ اتنا بڑھ جائے کہ سانس لینا بھی دشوار نظر آئے تو یہ مناسب ترین وقت ہے کہ فی الفور کوئی ذہنی ضابطہ نافذ کر کے خود کو سبکسار کرنے کی مساعی کا آغاز کر دیا جائے۔

مگر تجربہ شاہد ہے کہ خود کو سبکسار کرنے کی یہ مہم اپنے ابتدائی خروش کے بعد بڑی تیزی سے کم زور پڑنے لگتی ہے اور پھر کسی ایک مقام پہ رُک کر اپنی ساری منصوبہ بندی سے قطع تعلق کر لیتی ہے۔ یہ مہم ایک طرح کی سمندری موج ہے جو اپنی اوّلین یلغار میں سطحِ سمندر پر پھیلی ہوئی انگنت بدنما سلوٹوں پر پانی تو پھیرتی ہے مگر جب اس کے بعد رُکتی ہے تو سمندر کی سطح پر پہلے سے بھی زیادہ سلوٹیں نمودار ہو جاتی ہیں۔ میرے معاملہ میں یہ ہوا کہ کاغذات کو اُلٹتے پلٹتے، گرد و غبار میں راستہ بناتے اور بعض دیمک زدہ مسودات کو الگ کرتے ہوئے مجھے اچانک ایک نہایت بدوضع اور کرم خوردہ سا پیکٹ دکھائی دیا اور میں لحظہ بھر کے لئے رُک گیا تاکہ اُسے کچھ سُونگھ لوں تو آگے بڑھوں۔ اس وقت مجھے اس بات کا گمان بھی نہیں تھا کہ میرا یہ رُکنا مستقل نوعیت کا ہوگا اور میں کچھ اس طور کھو جاؤں گا کہ میرے ذہن سے صفائی کا جن ہی رُخصت ہو جائے گا۔ یہ پیکٹ دراصل میرا ایک بہت پرانا البم تھا جو آج سے کئی برس پہلے گم ہوا اور پھر تلاشِ بسیار کے باوجود ہاتھ نہ آسکا اور اب کہ میں اس کی ضرورت بلکہ وجود تک سے بے نیاز ہو چکا تھا، وہ ایک بھولی بسری یاد کی طرح وقت کی شاخ سے ٹوٹا اور میری پھیلی ہوئی جھولی میں آن گرا۔

میں نے البم پر سے گرد جھاڑنے کے لئے اسے ہلکی سی تھپکی دی اور پھر اس کے پھولے

ہوئے چمڑے کی جلد کو ایک طرف سے اُوپر اٹھایا۔ تب اچانک البم کے پہلے ہی صفحے پر مجھے ایک چمکتی ہوئی تصویر دکھائی دی۔ پہلی نظر میں تو میں ان صاحب کو پہچان بھی نہ سکا جو سر پر سیاہ بالوں کا ایک گھنا جنگل اٹھائے، ایک کالی عبا زیبِ تن کئے، اپنے سیدھے ہاتھ کے پنجے میں ایک لمبی اور گول سی کاغذ کی نلکی مضبوطی سے پکڑے، فوٹو گرافر کے حکم کی تعمیل میں اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ ایک بھیگی سی خفّت آمیز مسکراہٹ سجائے کھڑے تھے۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے میں نے ان صاحب کو پہچان لیا کیوں کہ یہ میری ہی تصویر تھی۔ اس روز آج سے تقریباً چالیس سال اُدھر مجھے ایم اے کی سند ملی تھی اور میں بھاگم بھاگ انارکلی کے ایک پارسی فوٹو گرافر کے سٹوڈیو میں جا پہنچا تھا۔ میں سوچنے لگا نجانے وہ فوٹو گرافر اب زندہ بھی ہے یا نہیں اور وہ کرائے کی کالی عبا؛ اب تک ضرور تار تار ہو چکی ہوگی اور وہ ایم اے کی حسین سند؟۔ کہاں ہے وہ سند؛ ان کاغذوں کے انبار میں دیمک کے متعدد اور مسلسل حملے سہنے کے بعد اپنے مسخ شدہ چہرے کو چھپائے کہیں نہ کہیں ضرور دبکی پڑی ہوگی۔ شائد کسی روز البم کی طرح وہ بھی دکھائی دے جائے۔

میں چند صفحے آگے بڑھا تو مجھے ایک مدھم سی تصویر دکھائی دی جو کسی سستے کیمرے اور اناڑی فوٹو گرافر کی چغلی کھا رہی تھی۔ تصویر ایک پہاڑی علاقے کی تھی۔ پس منظر میں چیل کے درختوں سے لدا ہوا ایک پہاڑ کھڑا تھا اور پہاڑ کے قدموں میں ایک کائی زدہ چٹان پر پھولے ہوئے گالوں اور چمکتی ہوئی آنکھوں والے دو لڑکے بیٹھے تھے۔ ان میں ایک شمس تھا اور دوسرا میں! پھر مجھے یاد آیا کہ اس روز میں شمس کے دادا جان کی پہاڑی اقامت گاہ پر انہیں سلام کرنے گیا تھا اور انہوں نے اپنے چار پانچ پوتوں کی قطار میں مجھے ایک قابلِ عزت مقام پر بٹھا کر گھنٹہ بھر اخلاقیات پر لیکچر دیا تھا اور

جب ہماری حالت غیر ہونے لگی تھی تو از راہِ کرم اپنی آستین سے ایک چٹکلہ اکیلا نکال کر ہم میں تقسیم کر دیا تھا۔ شمس کے دادا جان ایک نہایت کنجوس مگر بڑے ہی شفیق اور انصاف پسند بزرگ تھے۔ اس روز بھی انہوں نے اس اکلوتے کیلے کو تقسیم کرنے سے پہلے اس پر پنسل سے نشانات لگائے تھے تاکہ ہم میں سے کسی کی حق تلفی نہ ہو اور پھر کیلے کو گنڈیریوں کی طرح کاٹ کر ہم میں تقسیم کر دیا تھا۔ پھر جب ہمیں چھٹی ملی تھی تو ہم دادا جان کے کمرے سے آزاد کئے گئے قیدیوں کی طرح دیوانہ وار نکلے تھے اور پہاڑی بکروں کی طرح قلانچیں بھرتے ہوئے چٹانوں پر چڑھ گئے تھے۔ یہ تصویر اسی جشنِ آزادی کے موقعہ پر ہمارے کسی ہم عمر نے اتاری تھی۔ وہ ہم عمر کون تھا؟ کچھ یاد نہیں۔

البم کے اگلے صفحے پر مجھے ایک ایسی تصویر دکھائی دی کہ ایک پورا دور گھوم کر میری گود میں آگرا۔ اس تصویر میں میری والدہ پلنگ پر بیٹھی تھیں۔ سامنے کھانے کا ٹرے رکھا تھا۔ ان کے ایک ہاتھ میں لقمہ تھا اور دوسرے ہاتھ میں پنکھا! پاس ہی میرے بڑے بھائی جان بیٹھے تھے۔ نجانے انہوں نے کیا بات کہی کہ والدہ بے اختیار ہنس پڑیں عین اُس وقت میں نے اپنے کیمرے کا رُخ ان کی طرف کیا اور اس درخشاں لمحے کو کاغذ پر منتقل کر لیا۔ میری والدہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں اور بڑے بھائی جان بھی رُخصت ہو چکے مگر یہ ہنستا ہوا منور لمحہ بدستور زندہ ہے۔ ایک مدت کے بعد میں نے اپنے کھوئے ہوئے البم میں اس لمحے کو پہلی سی تابانی کے ساتھ ہنستے ہوئے دیکھا تو خود بھی کھِل اُٹھا جیسے کوئی بہت بڑا انعام مِل گیا ہو۔

میں البم کے گہرے غار میں اترتا چلا گیا۔ اس غار کے ہر موڑ پر مجھے کوئی نہ کوئی لمحہ دست بستہ کھڑا ملا۔ بعض لمحے جو نو وارد تھے، بڑی آسانی سے یاد کی گرفت میں آگئے لیکن بعض

لمحے ایسے بھی تھے جو یادداشت کی سرحد پار کر چکے تھے اور اب منت سماجت پر بھی واپس آنے کو تیار نہ تھے۔ یوں بھی زمانے کی مرطوب ہوا نے ان پر سبز کائی کا ایک غلاف کچھ اس طور چڑھا دیا تھا اور ان کے خدوخال اس حد تک ماند پڑ گئے تھے کہ اب ان سے وابستہ کوئی ایک یاد بھی باقی نہیں تھی۔ اگر میرے البم میں صرف اسی ایک قسم کے متحجرات ہوتے تو میں فی الفور اسے دوبارہ ردی کے انبار پر پھینک دیتا مگر اس میں تو درجنوں تصاویر ایسی بھی تھیں جو نظر کے ہلکے سے لمس پر باقاعدہ دھڑکنے اور سانس لینے لگتیں اور ان سے منسلک ایک پورا عہد انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتا۔ شاید البم کی سب سے بڑی خوبی بھی یہی ہے کہ وہ اپنے دامن میں زندہ اور متحرک لمحوں کی ایک پوری کھیپ چھپائے ہوتا ہے۔ اگر البم کی تصویریں یاد کے نورانی حلقوں سے محروم ہو جائیں اور ان سے وابستہ، چمکتے ہوئے لمحات بجھ جائیں تو البم البم نہیں رہتا تصویروں کا مُردہ خانہ بن جاتا ہے۔ البم تو البم والے کی شخصی جائیداد ہے لیکن ایک ایسی جائیداد جسے کوئی اور اپنے تصرف میں لا ہی نہیں سکتا وجہ یہ کہ البم لاجونتی کی طرح ہے۔ اسے کوئی نامحرم ہاتھ مس کرے تو فوراً مرجھا جاتا ہے۔ ہاں جب پیار بھری مانوس نظریں اس کی طرف اٹھتی ہیں، نظریں جو بہت کچھ جانتی ہیں تو یہ ہمکنے اور کلیلیں کرنے لگتا ہے۔ بالکل آپ کے معصوم بچے کی طرح!

روشنی ماند پڑنے لگی تھی۔ میں نے اپنے "یوسفِ گم گشتہ" کو اٹھا کر جیب میں رکھ لیا اور پھر بڑی محنت سے الگ کئے ہوئے مسوّدات کو دیمک زدہ کاغذی پہاڑوں پر جگہ جگہ ڈھیر کر دیا۔ اب کمرے کا انتشار پہلے سے بھی کئی گنا نظر آ رہا تھا۔ فضا میں گرد کے لاکھوں ذرات اُڑ رہے تھے اور میرا سانس رُکنے لگا تھا مگر میرا البم میری جیب کے اندر ضیا پاش تھا اور خوشی میری آنکھوں سے پھوٹ رہی تھی!

اسم اور فعل

بے نام تو شاید میں کبھی بھی نہیں تھا۔ جب میں پیدا ہوا اور ابھی محض سُرخ رنگ کا ایک لوتھڑا تھا تو دیکھنے والوں نے دیکھ لیا کہ میری پیشانی پر اسمِ نکرہ کی مُہر ثبت تھی۔ اس مُہر کی موجودگی میں کس کی مجال تھی کہ وہ مجھے آدمیت کے دائرے سے خارج کرنے کی جسارت کرتا، سو میں آدمی پیدا ہوا اور میرے مقدر میں یہ بات لکھ دی گئی کہ آخری دم تک میں آدمی ہی رہوں گا۔ میں انسان نہ بھی بن سکا تو بہرحال آدمی کے اعزاز سے مجھے کوئی محروم نہ کر سکے گا۔ آدمی میرا اسمِ نکرہ تھا۔ سونے کا وہ تمغہ جو پہلی سوگز کی دوڑ میں اوّل آنے پر مجھے ملا تھا۔ ویسے میں اس دوڑ میں اکیلا بھی نہیں تھا۔ لاکھوں کروڑوں چیمپئن قسمت آزمائی کر رہے تھے مگر میں نے سب کو مات دی اور سب سے پہلے منزلِ مقصود تک پہنچا۔ یہ دوڑ بھی عجیب دوڑ تھی کہ اس میں صرف وہی بدبخت زندہ رہا جو کامیاب ہوا۔ باقی سب کامریڈ دوڑ میں ہارنے کے جُرم کی پاداش میں زندگی کی رمق ہی سے محروم کر دیئے گئے۔

جب میں نے پہلی بار احساس کی آنکھ سے دیکھا تو میں یہ جان کر حیران ہوا کہ مجھ پر جو مہربان چہرہ جُھکا ہوا تھا، اس کی پیشانی پر اسمِ معرفہ کی روشن مُہر ثبت تھی۔ اس دُوسری

مُہر کو دیکھتے ہی مجھے اپنی محرومی کا احساس بڑی شدت سے ہوا کہ ابھی مجھے میرا تشخص ہی عطا نہیں ہوا تھا۔ مجھے فطرت سے کوئی گِلہ شکوہ بالکل نہیں تھا کہ فطرت بے چاری تو صرف اسمارِ نکرہ تقسیم کرنے پر ہی مامور ہے۔ اس کی زنبیل میں دوسرے اسمار تو شاید موجود ہی نہیں۔ یہ سارے اسمار آدمی نے محض اپنی سہولت کے لئے خود ہی وضع کئے ہیں تاکہ گوشت خوروں کو سبزی خوروں سے اور اکھاڑے کے پہلوانوں کو سخن کے پہلوانوں سے الگ کرکے ان میں سے ہر ایک کی پہچان کر سکے۔ میں نے دیکھا کہ مجھ پر جُھکے ہوئے ایک روشن چہرے کے سوا باقی سب چہرے اپنے تشخص سے محروم تھے بس غدر کی سی کیفیت تھی۔ اشیاء، افراد، اعمال سب آپس میں گڈ مڈ سے ہو رہے تھے۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہی مجھے یکایک غصّہ آگیا اور میں نے اپنی آنکھیں میچ کر پہلی زوردار احتجاجی چیخ سے اپنی آمد کا اعلان کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ میری چیخ کارگر ثابت ہوگی اور مجھ پر جُھکے ہوئے چہرے بادلوں کی طرح چھَٹ جائیں گے مگر نہیں! اس کا تو اُلٹا اثر ہوا۔ مزید خوفناک چہرے مجھ پر جُھک آئے اور میری آہ وزاری کو سُن کر اتنے خوش ہوئے کہ ان کی باچھیں کانوں تک کھِل گئیں اور پھر کئی روز تک واپس اپنی جگہ پر نہ آسکیں۔

اور پھر یوں ہوا کہ کسی نے کھٹ سے میری پیشانی پر بھی اسمِ معرفہ کی مُہر ثبت کر دی اب میں اپنے نئے گھر میں اجنبی نہیں تھا۔ مجھے اب شناختی کارڈ عطا کر دیا گیا تھا۔ جس میں میرا نام، ذات، مذہب اور تاریخ پیدائش درج تھی، پیشے کا خانہ ابھی خالی تھا یہ مجھے خود ہی بھرنا تھا یا شاید نہیں بھرنا تھا۔ کون جانے! ایک معزز شہری بن جانے کے بعد اب میں نے اپنی نئی دُنیا کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ میں نے دیکھا کہ فطرت

نے کمال ہنرمندی سے ہر شے کو اسم نکرہ عطا کر رکھا تھا مگر مجھے محسوس ہوا کہ اس جینرک نام کی مدد سے میں مستقیم خطوط تو کھینچ سکتا تھا مگر چھوٹے چھوٹے دائرے نہیں بنا سکتا تھا اور دائرے بنائے بغیر میرے لئے چیزوں کی شناخت ایک انتہائی دشوار عمل تھا۔ سو میں نے اس شبہ کا خود ہی آغاز کر دیا اور میرے منہ سے اسماء کا ایک سیلاب سا اُمڈ کر چاروں طرف چھوٹے چھوٹے بھنور سے بنانے لگا۔ اس وقت میں ایک اپنی تو تلی زبان تخلیق کر رہا تھا، نئی لسانی تشکیلات کو جنم دے رہا تھا مگر پھر میں نے یہ بھی دیکھا کہ میری چھوٹی سی دُنیا کو ایک بڑی بوڑھی دنیا نے اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔ اس بڑی دنیا کی ایک اپنی بوڑھی زبان تھی جسے سمجھے اور بولے بغیر میں پہچان کے مراحل سے گزر ہی نہیں سکتا تھا۔ سو میں اس زبان کی طرف بڑھا جس میں اسماء کثرتِ استعمال سے گھس پٹ کر بیضوی صورت اختیار کر چکے تھے اور پردہ در پردہ اور نقاب اندر نقاب نظر آ رہے تھے۔ پہلے تو میں نے محض اسم نکرہ اور اسم معرفہ کی تقسیم سے آشنائی حاصل کی تھی مگر اب میں نے دیکھا کہ ہر اسم کے اندر کئی اسماء چھپے ہوئے تھے۔ ہر چہرے کے اندر کئی چہرے مستور تھے۔ چاروں طرف مختلف اسماء سے نظر آ رہے تھے۔ چھوٹا بڑا، کالا گورا، جھوٹا سچا، صبح و شام، دن اور رات، ہر چیز کو اس کی کارکردگی، صفت، صورت یا جنس کی بنا پر ایک الگ اسم کے دائرے میں سمیٹ لیا گیا تھا۔ ہر جگہ، ہر لمحہ آدمی اپنی پہچان کرا رہا تھا، اشیاء کو پہچان رہا تھا۔ کبھی وہ ایک ہی وضع کی اشیاء کو پکڑ پکڑ کر کسی بڑے پنجرے میں قید کرتا۔ کبھی بڑے پنجرے میں سے چُن چُن کر اشیاء کو باہر نکالتا، پھر انہیں چھوٹے بڑے پنجروں میں منتقل کر دیتا۔ مجھے یوں لگا جیسے زندگی ایک بہت بڑا سٹریٹیٹ ہے جس میں آدمی ایک انتھک سیکشن آفیسر کی طرح ہر شے اور منظر کی ایک

الگ فائل تیار کرتا ہے۔ بعض فائلوں کو سبز زنگ کے فیتے سے باندھتا ہے۔ بعض کو سُرخ یا کالے رنگ کے فیتے سے۔ ہر لمحہ زندگی کی تُند و تیز ہوائیں اس کی فائلوں کے اوراق کو بکھیرتی ہیں مگر دوسرے ہی لمحے وہ انہیں پھر سے مرتب کر دیتا ہے۔ اس کے سامنے ایک مہیب و بسیط کانٹوں اور جھاڑیوں سے اُٹا ہوا ایک کاغذی جنگل ہے جس میں سے اسے راستہ تراشنا ہے مگر وہ جانتا ہے کہ جس ہتھیار سے اُسے یہ راستہ تراشنا ہے اس کا نام ہے اسم! یہ وہ کلمہ ہے جس کا مفہوم "کھُل جا سم سم" کے مترادف ہے۔ یہ وہ کلید ہے جس کی مدد سے اُسے زندگی کے حجُرۂ ہفت بلا کا پہلا زنگ آلود تالا کھولنا ہے۔ اسم جاننے اور پہچاننے کے عمل کی ابتدا ہے۔ عرفان کا ایک چمکتا ہوا لمحہ ہے۔ اسم نہ ہوتا تو کوئی شے بھی اپنا اعلان نہ کر سکتی۔ کوئی شے بھی پہچانی نہ جا سکتی!

مگر عرفان کا لمحہ اگر زیادہ طویل ہو جائے تو بلائے جان دکھائی دینے لگتا ہے۔ سومیر بھی کچھ ہی عرصہ کے بعد اُکتاہٹ سی محسوس کرنے لگا۔ ہر شے کی پیشانی پر اس کا نام کندہ تھا۔ زندگی نمبروں، شعبوں، رنگوں، جماعتوں، فرقوں اور شخصیتوں میں منقسم تھی مگر یہ ایک جامد دنیا تھی۔ ایک تصویر خانہ جس کی ساری تصاویر منجمد لمحات کی طرح رُکی کھڑی تھیں۔ میری اس دُنیا میں حرکت نام کو نہیں تھی۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ خود زندگی ایک صبا رفتار اونٹنی کی طرح ہر دم متحرک رہتی ہے بلکہ زندگی تو اونٹنیوں کی ایک قطار، دوڑتے ہوئے لمحوں کی ایک زنجیر ہے۔ یہ ایک خاص مقام سے چلی تھی، اب ایک خاص نقطے پر موجود ہے۔ آئندہ کسی اور جگہ دکھائی دے گی۔ جب تک مجھے زندگی کی اس حرکت کا علم اور احساس نہ ہو میں کیسے سمجھوں کہ میں نے اس کے چہرے کو بے نقاب کر دیا ہے۔ لہٰذا اب مجھے ایک اور کلید کی ضرورت محسوس ہوئی جو زندگی کے دوسرے زنگ آلود تالے کو

کھول سکے۔ اسم پہلی کلید تھا، فعل دوسری کلید کے روپ میں اُبھرا۔ اسم نے انتشار میں سے تنظیم کو جنم دیا تھا اور ہر شے کو نام عطا کر کے اس کی شناخت کی تھی۔ فعل نے نہ صرف ان اشیاء کو مربوط کیا بلکہ انہیں وقت کے کینوس پر متحرک ہونے کی ترغیب بھی دی۔ اب زندگی ازل اور ابد کے درمیان ٹھہری ہوئی کوئی جھیل نہیں تھی بلکہ ایک کارواں تھی جس کا ماضی بھی تھا، حال بھی اور مستقبل بھی! یہ کارواں کب شروع ہوا؟ آج وہ سفر کے کن مراحل میں ہے؟ آگے چل کر وہ کہاں پہنچے گا؟ پہنچے گا بھی کہ نہیں؟ فعل کی آمد ہی سے اِن انہونے سوالات کو تحریک ملی اور پھر میں نے دیکھا کہ میں ایک لمحے کی صورت کسی بادبانی کشتی میں سوار ہوں قطب ستارہ میرے سامنے ہے، ہوا میرے عقب میں ہے اور ایک مسلسل سفر میری تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے۔ پہلے میں صرف اسماء کی دُنیا کا باسی تھا اور یہ دنیا حال کے نقطہ پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رُکی کھڑی تھی مگر اب فعل نے آکر اس دنیا کو ایک ہی ٹھوکر سے ماضی، حال اور مستقبل کی کرچیوں میں بانٹ دیا اور پھر ضروری وقفے کے بعد ان کرچیوں کو چکتے ہوئے منکوں کی طرح ایک ہی دھاگے میں پرو ڈالا۔ معاً مجھے محسوس ہوا کہ فعل تو تاریخ کو جنم دیتا ہے، وقت کو وجود میں لاتا ہے، ہمت کا تعین کرتا ہے، عجیب سا احساس تھا! جیسے کسی بیہوش شخص کے چہرے پر ٹھنڈے پانی کا چھینٹا مار دیا جائے اور وہ خواب کی دُنیا سے حقیقت کی دنیا میں آجائے اور پھر دیکھے کہ اس کے چاروں طرف لامحدود دُوریوں تک پھیلی ہوئی کائنات ایک مجسّم "فعل" ہے جسے اس نے غلطی سے "اِسم" سمجھ لیا تھا۔

چلنا!

لیٹنے کی انسٹی ٹیوشن شاید روزِ اوّل ہی سے افیونیوں اور پوستیوں کی تحویل میں ہے اور بیٹھنے کا پورٹ فولیو ان لوگوں کے سپرد ہے جو فطرتاً بڑے گھاگ ہوتے ہیں۔ مگر چلنے کا عمل آزاد منش افراد کی میراث ہے۔ یہ گویا دھرتی کے چنگل سے آزاد ہونے کی پہلی انسانی کاوش ہے۔ چلنے کے بعد اُڑنے اور اُڑنے کے بعد تنِ خاکی سے پرواز کرنے میں صرف مدارج کا فرق ہے ورنہ دراصل یہ تینوں ایک ہی ملکوتی عمل کی مختلف صورتیں ہیں۔

میں اس تلخ گوئی کے لیے اپنے وطن کے تمام پوستیوں، افیونیوں اور خاندانی گھاگوں سے معذرت خواہ ہوں لیکن کیا کروں مجھے لیٹنے کے عمل سے ہمیشہ نفرت محسوس ہوئی اور کسی شخص کو عارفانہ انداز میں گم سُم بیٹھے دیکھ کر مجھے ہمیشہ یہ شک پڑا کہ اس نے اپنے نیچے کوئی شے چھپائی ہوئی ہے۔ یادش بخیر جب بنیا لوگ ہمارے معاشرے پر مسلط تھے تو بیٹھنے کے کرب انگیز مناظر اکثر دیکھنے کو ملتے۔ مثلاً کسی دوکان میں سفید بے داغ گدّی پر کوئی بھاری بھرکم چیز براجمان ہوتی اور گدّی کے نیچے نوٹوں اور چاندی کے روپوں کا ایک پورا انبار سینڈوچ حالت میں پڑا ہوتا اور جیسے جیسے اس انبار میں اضافہ ہوتا چلا جاتا، طمانیت کی ایک گرم رَو گوشت کے پہاڑ کی چوٹی کی طرف سرکنے لگتی تاآنکہ ایک

— مگر وہ سی مسکراہٹ میں ڈھل کر کالے موٹے ہونٹوں سے چپک جاتی۔ شاید بنیئے کے اسی وصف خاص نے اُس روایت کو جنم دیا ہے جس کے مطابق مایا کے ہر ڈھیر پر کالا ناگ کُنڈلی مارے بیٹھا رہتا ہے۔

بیٹھے ہوئے شخص کی آنکھوں میں ریاکاری کا زہر صاف نظر آجاتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ شخص چلنے کے عمل سے تو پوری طرح واقف ہے لیکن جان بُوجھ کر خود کو لیٹنے والوں کے قبیلے کا ایک فرد ظاہر کر رہا ہے۔ بیٹھنا بجائے خود کوئی مستقل کیفیت نہیں یہ تو محض چلنے اور لیٹنے کے درمیان "تیسری جنس" قسم کی کوئی چیز ہے جس میں چلنے کی حرکی کیفیت کا پرتو بھی موجود ہے اور لیٹنے کی نیند آور کیفیت کی جھلک بھی! بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا بے حد مشکل ہے کہ اس کا ارادہ بستر پر دراز ہونے کا ہے یا منہ اُٹھا کر چل دینے کا — جب وہ بستر پر براجمان اپنے بدن کو حرکت دیتا ہے تو بھی آپ یہ نہیں جان سکتے کہ یہ شخص اب کس کروٹ بیٹھے گا۔ اس کا ہر عمل غیر یقینی اور اس کی ہر حرکت مشکوک ہوتی ہے۔ لیٹے ہوئے شخص میں یہ بات نہیں جو ایک بار لیٹ گیا اس کے مسلک کے بارے میں تمام شکوک و شبہات گویا آنِ واحد میں ختم ہو گئے۔ اب اس سے گھبرانا یا خوف زدہ ہونا بالکل بے کار ہے۔ یہ بے چارہ تو اب کسی قسم کی تگ و دو کے قابل ہی نہیں رہا۔ تسلیم کہ وہ کبھی ایک تناور درخت ہوگا۔ مگر اب تو وہ بیج میں ڈھل کر زمین کی کوکھ میں پہنچ چکا ہے۔ بیٹھے ہوئے شخص کو ریشم کے اس کیڑے سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے جو مہینہ بھر بے تحاشا کھانے کے بعد آرام کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور اپنے گرد ایک نرم و نازک سا "گویا" تعمیر کر کے اس میں گہری میٹھی نیند سو جاتا ہے۔ آپ چاہیں تو اسے شیر خوار بچے سے بھی تشبیہہ دے سکتے ہیں کیوں کہ وہ اب پلنگ کی چھاتی سے

چٹالوری کی بیٹھی مدھر آواز میں گم، نیند کی گرم و گداز گود میں پوری طرح ڈوب چکا ہے ہر چہ باداباد! اس شخص کو اب نہ تو اُس "گردشِ روزگار" سے کوئی غرض ہے جو نجانے کب سے آنگن میں بیٹھی کپڑے دھو رہی ہے اور نہ اُسے اُن "آلامِ زمانہ" سے کوئی واسطہ ہے جو باہر گلی ڈنڈا کھیلنے میں منہمک ہیں۔ حد یہ کہ وہ اُن آفاتِ ارضی و سماوی سے بھی بے نیاز ہے جو بلوں کے وزٹنگ کارڈ ہاتھ میں لئے صبح سے شام تک اس کے دروازے پر دستک دیتی رہتی ہیں لیٹے ہوئے شخص کو ان میں سے کسی بھی تُند و تیز بگولے سے خوف محسوس نہیں ہوتا۔ خوف تو اُسے محسوس ہوگا جو بیٹھا ہوا ہو یا جس کے قدم حرکت میں آگئے ہوں۔ بیٹھے ہوئے شخص کو اس لئے خوف محسوس ہوگا کہ کہیں بگولا اُسے اس کی اصل جگہ سے سرکا نہ دے کیوں کہ اگر ایسا ہُوا تو پھر اس "انبار" کا کیا ہوگا جسے اس نے کمال ہوشیاری سے اپنی گدی تلے چھپا رکھا ہے۔ اسی طرح چلتے ہوئے شخص کو یہ خطرہ لاحق ہوگا کہ کہیں بگولا اس کی جہت نہ بدل ڈالے اور وہ بڑے ڈاک خانے تک پہنچنے کے بجائے میانی صاحب پہنچ جائے۔ لیکن لیٹے ہوئے شخص کو ایسا کوئی خطرہ درپیش نہیں۔ یہی اس کا المیہ بھی ہے!

اگر لیٹا ہوا شخص طفلِ شیر خوار کے مانند ہے تو بیٹھا ہوا شخص اس بچے کی طرح ہے جس نے "لیٹنے کے عمل" کو عبور کر کے بستر پر بیٹھنا سیکھ لیا ہو۔ لیٹنے والے کا عمل قطعاً غیر شعوری تھا۔ اپنی اس حالت میں وہ درخت کی شاخ سے چمٹے ہوئے بندر کے اُس بچے کی طرح تھا جسے اپنے وجود کے تحفظ کے سوا اور کوئی کام ہی نہ ہو۔ لیکن جب اس نے "بیٹھنا" سیکھ لیا تو گویا اب اس کے ہاں ایک عجیب سا اعتماد پیدا ہو گیا۔ پھر اس اعتماد نے دیکھتے ہی دیکھتے احساسِ ملکیت کو جنم دے ڈالا۔ اب وہ کھلونوں کو اپنے سینے سے چمٹانے گا۔ انہیں اپنی تحویل میں رکھے گا اور اپنی جملہ آرزوؤں کی تکمیل کے

لیئے چالاکی اور شرارت کے ہر حربے کو استعمال میں لائے گا۔ یہی اس کی زندگی کا عزیز ترین مشن ہے۔ وہ اب پنگھوڑے سے نکل کر گدی پر آ بیٹھا ہے۔ اب با ادب باملاحظہ ہوشیار رہنے کی بھی اشد ضرورت ہے کیوں کہ اس مقام سے آگے آپ کا واسطہ کسی بے بس اپاہج ہستی سے نہیں بلکہ ایک نہایت زیرک اور چالاک انسان سے ہے۔

چلنا اس سے اگلا قدم ہے۔ اب یہی بچہ گدی کو چھوڑ کر زمین پر کھڑا ہو گیا ہے اور اپنے چھوٹے چھوٹے پاؤں کی بیساکھیوں کا سہارا لیئے بھری کائنات میں مصروف خرام ہے۔ اس کی حالت اس سورج کی سی ہے جس نے رات کی انگنت بانہوں سے خود کو آزاد کر لیا ہے اور اب اپنے سر پر آسمان کی نیلی چھتری تلنے ایک کبھی نہ ختم ہونے والے سفر پر روانہ ہے۔ کہتے ہیں یونسؑ کو مچھلی نے نگل لیا تھا اور یوسفؑ کو کسی اندھے کنویں میں قید کر دیا گیا تھا لیکن اب نہ تو شکمِ ماہی باقی ہے اور نہ کنویں کا دُردِ تہ جام۔ اب تو لوگ صدیوں کی قید سے یکایک آزاد ہو گئے ہیں اور آپ انہیں سڑکوں پر سیٹیاں بجاتے صحراؤں میں خاک چھانتے اور چلتی ہوئی ٹرین کے ہینڈل سے چمٹے ہوئے بآسانی دیکھ سکتے ہیں۔

لیٹنا خاک میں مِل کر خاک ہو جانا ہے۔ بیٹھنا کسی چوہے کے بِل میں سے سر نکال کر اور گرد و پیش پر ایک نظر ڈال کر دوبارہ بِل میں دبک جانا ہے لیکن چلنا بل کو الوداع کہنا اور کھلے منہ، سرِبازار نکل آنا ہے۔ لیٹنے میں ارادے کو کوئی دخل نہیں۔ یہ تو ایک مجبوری ہے جس سے بچاؤ کی کوئی صورت ممکن ہی نہیں۔ دوسری طرف بیٹھنا ایک شعوری عمل ہے جس کے سامنے بجز آنکھ مچولی اور کوئی مقصد نہیں لیکن چلنا ایک گہرے عزم کا سمبل ہے۔ ایک زبردست قوتِ ارادی کے بغیر دو قدم چلنا بھی ممکن نہیں۔ جن لوگوں نے چلنے کو بازیچہ اطفال سمجھا تھا ان کے نام سرکاری ہسپتالوں کے رجسٹر حادثات میں درج ہیں۔ آپ کسی

بھی وقت ان ناموں کو پڑھ کر عبرت حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر چلنے میں ایک اور خوبی بھی ہے جس سے لیٹنے اور بیٹھنے والے یکسر محروم ہیں۔ چلنے والا ہمیشہ ایک خاص سمت میں سفر کرتا ہے۔ سمت منزل کی طرف دوڑتی ہے اور منزل شخصیت کی تکمیل کا اعلان کر دیتی ہے۔ اس کے برعکس لیٹا ہوا شخص جہت اور منزل دونوں سے ناآشنا ہے اور بیٹھے ہوئے شخص کی جڑیں دھرتی سے اس درجہ چمٹی ہوتی ہیں کہ وہ خواہش کے باوجود سمت اختیار کرنے سے قاصر ہے۔ یہ دونوں بے بسی اور مجبوری کی منہ بولتی تصویریں ہیں جنہیں آپ نے اپنے گھر کی دیوار پر آویزاں کر رکھا ہے۔ یہ کل بھی اس دیوار پر تھیں، آج بھی وہیں سے آپ کو گھور رہی ہیں اور کل بھی یہیں براجمان ہوں گی۔ مگر چلنا تو ایک فلمی تصویر ہے۔ آپ جب بھی اسے دیکھیں یہ حرکت کرتی ہوئی نظر آئے گی لیکن جب تک یہ حرکت کسی نقطۂ تکمیل کی طرف گامزن نہ ہو اسے برکت کہنا بہت مشکل ہے۔ پاکستانی فلمیں مجھے خاص طور پر اسی لئے پسند ہیں کہ یہ نقطۂ تکمیل کا اس سنجیدگی سے تعاقب کرتی ہیں جیسے بر کے گھر کو تلاش کر رہی ہوں۔

ہجرت

شام کا وقت ہے لیکن ابھی شام کا ستارہ نمودار نہیں ہوا۔ رات کے پنچھی بھی غائب ہیں آسمان پر کوئی سُست رو آوارہ حال ٹکڑا ابر بھی موجود نہیں۔ پورا آسمان ایک سفید رنگ مچھر دانی کی طرح مجھ پر جُھک آیا ہے۔ میرے پاؤں کے نیچے سبز اور مٹیالے رنگوں والی دھرتی ایک بستر کی طرح ہے جس کے عین درمیان ایک سیاہ نقطہ چمک رہا ہے۔ یہ سیاہ نقطہ میں خود ہوں۔ زمین و آسمان کے ملتے ہوئے ہونٹوں کی لکیر نے میرے چاروں طرف ایک طلسمی دائرہ سا کھینچ دیا ہے اور جس طرح اندھیرے میں موم بتی جلا دی جائے تو وہ اپنے گرد از خود نور کا ایک دائرہ بنا لیتی ہے، بالکل اسی طرح میں نے اپنے وجود کی روشنی سے اپنے گرد ہست کا ایک دائرہ سا تعمیر کر لیا ہے۔ یہ دائرہ اپنے مرکز کے سیاہ دھبے سے اس درجہ منسلک ہے کہ اگر یہ دھبا اپنی جگہ سے سرک جائے تو اسی نسبت سے دائرہ بھی اپنی جگہ تبدیل کر لے گا۔ عجیب معاملہ ہے! میں تیز تیز قدم اٹھائے ایک طرف کو چل دیتا ہوں اور پھر رُک کر چاروں طرف دیکھتا ہوں۔ آسمان کی مچھر دانی بدستور مجھ پر جُھکی ہوئی ہے اور میں بدستور زمین کے بستر کے عین درمیان بے حس و حرکت پڑا ہوں۔ تو کیا میں کہ اپنے وجود کا مرکزی نقطہ ہوں، خود اپنے وجود کی قید میں نہیں ہوں؟

مگر قید اور آزادی تو محض اضافی باتیں ہیں۔ بڑی سے بڑی آزادی کے گرد بھی ایک دائرہ سدا موجود رہتا ہے۔ ہر آزاد ملک اپنی سرحدوں میں قید ہے۔ بات شاید احساس کی ہے۔ میرے لئے کبھی تو میرا چھوٹا سا کمرہ بھی بے کنار اور لامتناہی ہے اور کبھی لامحدود کائنات بھی ایک بندی خانہ ہے۔ اور کبھی کبھی مجھے یہ بھی محسوس ہوا ہے کہ جیسے میں خود اپنے بدن کی چار دیواری میں بند ہوں۔ مگر دوسرے ہی لمحہ ایک اور احساس نے مجھے گدگدایا ہے کہ اگر میری تحویل میں میرا بدن نہ ہوتا تو میں اپنے پانچوں حسّی آلات سے محروم ہونے کے باعث اپنے اردگرد کی دُنیا تک کا ادراک نہ کر سکتا۔ تو کیا میرا یہ احساسِ آزادی محض اس لئے نہیں کہ میں اپنے جسم کی قید میں ہوں؟ سچ بات تو یہ ہے کہ ہر دائرہ ایک گھونسلے کی طرح ہے جس میں اس کا مرکزی نقطہ ایک پرندے کی طرح منقار زیرِ پر ہے یا شاید فطرت نے ہر مرکزی نقطے کے لئے ایک دائرے کا اہتمام کیا ہے۔ پرندے کو گھونسلا، بچے کو ماں کی گود اور زندگی کو زمین کی کوکھ عطا کی ہے۔ فطرت کی نظروں میں دائرہ بیک وقت زندگی کے لئے ایک ناقابلِ تسخیر فصیل بھی ہے اور ایک آرام دہ جھولا بھی! فطرت نے "زندگی" کا کس قدر خیال رکھا ہے!

مگر خود فطرت کی سرشت میں بھی تو یہ بات موجود ہے کہ وہ گاہے گاہے اپنے گرد لپٹے ہوئے دائرے کو ایک کینچلی کی طرح اتار پھینکتی ہے۔ پرندہ گھونسلے کو، بچہ گود کو اور میں اپنے گھر کو خیرباد کہنے کے لئے بے قرار ہو جاتا ہوں۔ ہجرت فطرت کی ایک ناقابلِ فہم ادا ہے جو بیک وقت ایک کرب انگیز تجربہ بھی ہے اور تازہ معانی سے لبریز ایک واردات بھی!

مجھے فطرت کی یہ ساری ادائیں پسند ہیں۔ اس کی وہ ادا بھی جب وہ بڑے پیار

سے مجھے اپنے پروں میں سمیٹ لیتی ہے اور وہ بھی جب وہ پَر مار کر مجھے اڑا دیتی ہے مگر اڑانے کا یہ عمل ہے بالکل عارضی نوعیت کا۔ کیوں کہ جب میں تھکا ہارا اگلے پڑاؤ پر پہنچتا ہوں تو کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ میں دوبارہ مرکزِ ہست بن جاتا ہوں۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے نور کی ایک لکیر سی میرے اندر سے نکل کر ایک قوس کی صورت میرے چاروں طرف گھوم گئی ہے اور میں پھر سے اپنے وجود میں قید ہو گیا ہوں۔ شائد زندگی کی کہانی اس طوائف کی کہانی سے مختلف نہیں جسے شہر کے معززین نے شہر بدر کر دیا تھا مگر جس کے گرد کچھ ہی عرصہ کے بعد ایک پورا شہر اُگ آیا تھا۔

جب میں فطرت کے پروں تلے ہوتا ہوں تو زندگی ایک بنے بنائے ضابطے کے تحت بسر ہوتی ہے۔ خود مجھے ہر دم یہ وہم ستائے رکھتا ہے کہ اگر میں نے ضابطے کو چھوڑا یا دائرے کی لکیر کو توڑا تو مجھ پر کوئی بلائے ناگہانی نازل ہو جائے گی۔ صبح سویرے اُٹھتا ہوں تو ہمیشہ شیو کرنے سے پہلے دانتوں پر پیسٹ کرتا ہوں، جیسے اگر میں نے پہلے شیو اور بعد میں ٹوتھ پیسٹ کی تو قیامت آجائے گی۔ باہر جانے کے لئے کپڑے پہنتے ہوئے اس بات کا اطمینان کر لیتا ہوں کہ میں نے اپنی قمیص کا تیسرا بٹن بند نہیں کیا کیوں کہ کسی غیبی آواز نے مجھے بتا دیا ہے کہ اگر غلطی سے بھی یہ بٹن بند ہو گیا تو خوش بختی کی دیوی مجھ سے ناراض ہو جائے گی۔ گھر سے نکلتے وقت سڑک کے کنارے کے کھمبے کو بوٹ کی نوک سے ہلکی سی ٹھوکر لگانا ضروری ہے۔ واپسی پر اسی کھمبے پر ٹھوکے بغیر گھر میں داخل ہونا خطرے سے خالی نہیں۔ میں اپنے معمولات کی ایک ایک شق پر نظر رکھتا ہوں۔ اُٹھنا، بیٹھنا، چلنا پھرنا، ورزش کرنا اور نہانا یہ سب کچھ ایک خاص ضابطے، ایک خاص RITUAL کے ماتحت ہو تو جان کی سلامتی ہے ورنہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی بھی وقت کیا نہ ہو جائے! اگر کبھی

اس قاعدے اور روش میں ذرا سی بھی تبدیلی آتی ہے تو دل کسی انجانے خطرے کو محسوس کر کے کانپ اٹھتا ہے۔ فطرت نے اس بات کا خاص اہتمام کیا ہے کہ میں اس کی بنائی ہوئی گھاٹیوں سے ہرگز باہر نہ آؤں۔ جس طرح سورج کے طلوع و غروب میں ایک باقاعدگی ہے اور موسم ایک خاص ترتیب میں ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہیں، بالکل اسی طرح فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ میں اس کے ضابطۂ حیات سے سرِ مو انحراف نہ کروں۔ خود مجھے فطرت کی نرم اور ملائم انگلی کو تھام کر چلنے میں ایک عجیب سا سکون ملتا ہے۔ جیسے میری نبض اُس کی نبض سے ہم آہنگ ہو گئی ہو۔

لیکن کیا میں نے یہ ضابطہ، یہ پیڑن، یہ زندان اپنے لئے خود تعمیر نہیں کیا؟ یا شاید فطرت نے میرے لئے تعمیر کیا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ خود فطرت اپنے ہی ضابطے کی قید میں ہو۔ سو جب کبھی میرے دل میں یہ آرزو مچلتی ہے کہ میں اپنے زندان کی دیواروں کو توڑ کر دانۂ گندم کی لذت سے خود کو آشنا کروں اور پھر ایک طویل ہجرت میں مبتلا ہو جاؤں تو کیا یہ بغاوت خود فطرت کی طرف سے نہیں ہوتی؟ چلو مان لیا کہ یہ بغاوت فطرت کی طرف سے ہے مگر میں پوچھتا ہوں کہ یہ ہے کس کے خلاف؟ کیا فطرت خود اپنے خلاف بغاوت کرتی ہے؟ کیا بغاوت کرنا بھی اس کی سرشت کا ایک زاویہ ہے؟ امکان تو یہی ہے، ورنہ اس کا ارتقار کبھی کا رُک چکا ہوتا۔ سو اصل چیز ہجرت ہے۔ ہر ہجرت سے ایک نیا امریکہ دریافت ہوتا ہے، نئے رشتے وجود میں آتے ہیں، نئے معانی اُجاگر ہوتے ہیں ہجرت میں مبتلا ہوئے بغیر آئینۂ دل روشن نہیں ہو سکتا۔ ہجرت سے صدیوں کا زنگ اُترتا ہے۔ آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہوتی ہے۔ اپنے پرائے کا فرق دکھائی دینے لگتا ہے۔ ہجرت کے بغیر زندگی نامکمل ہے، چاہے ہجرت ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف ہو۔ ایک گلی

سے دوسری حویلی کی جانب یا ایک بدن سے دوسرے بدن کی اور۔ وہ شخص جو کھجور کے درخت کی طرح نخلستان کے چشمۂ شیریں میں صبح وسا اپنا عکس دیکھتا ہے، اُس چمک کو کیسے جان سکتا ہے جو ایک نخلستان سے دوسرے نخلستان میں پہنچنے پر تھکی ہاری اونٹنی کی آنکھوں میں نمودار ہوتی ہے۔ ہر کوندا دراصل حیرت کا کوندا ہے اور حیرت ہجرت کے بغیر ممکن ہی نہیں ؛

مگر ہجرت کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ انسان ایک درخت کی طرح ہے جو دھرتی کے بدن سے اپنے لئے غذا کشید کرتا ہے۔ لہٰذا جو خاصیت کسی خطۂ زمین کے دودھ، نمک اور پانی میں ہوگی، لازم ہے کہ وہ اس کے باسیوں میں بھی پیدا ہو جائے گی۔ آخر آخر میں تو دھرتی خلقِ خدا کو خود سے اس طور چمٹا لیتی ہے کہ من تو شُدم تُو من شُدی کا منظر دکھائی دینے لگتا ہے۔ سارے لوگ ایک ہی رنگ میں رنگے جاتے ہیں اور ایک ہی نمونے کے مطابق بنے ہوئے نظر آنے لگتے ہیں۔ ایسے میں اگر ہجرت کی نوبت نہ آئے تو انسان کی ساری اپج اور انفرادیت ختم ہو جائے۔ سو جب انسان کسی خطۂ زمین سے ہجرت کر کے کسی دیارِ غیر میں اپنی جڑیں اتارتا ہے تو اپنے بدن اور رُوح کو ایسے نئے اوصاف سے آشنا کرتا ہے جو نئی سرزمین کے دودھ، نمک اور پانی کی تاثیر سے عبارت ہوتے ہیں۔ ہجرت ایک کرب انگیز تجربہ تو ہے کیوں کہ جب کوئی ہجرت کرتا ہے تو دھرتی سے اپنی ساری جڑیں نکال نہیں پاتا۔ کچھ جڑیں زمین کی کوکھ میں ہی رہ جاتی ہیں اور ان کی یاد مدّتوں دردِ دل پر دستک دیتی رہتی ہے مگر ساتھ ہی ہجرت ایک کیف انگیز واردات بھی ہے کیوں کہ آپ ایک نئے خطۂ زمین کے خزائن اور اثمار سے اپنی جھولیاں بھر لیتے ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ کیا یہ ضروری ہے کہ آپ جسمانی طور پر بھی

ہجرت کریں، آپ اپنے پلنگ پر لیٹ کر بھی تو ہجرت کر سکتے ہیں۔ میری طرف دیکھئے، میں شاید ہی کبھی اپنے گھر سے باہر جاتا ہوں۔ مگر ہر شب جب آسمان پر ستارے چمکتے ہیں تو میں اپنی زمین سے منقطع ہو کر لاکھوں کروڑوں روشنی کے سالوں کا سفر کر کے نئی نئی سرزمینوں میں پہنچ جاتا ہوں اور پھر وہاں کے نمک، پانی اور دودھ سے خود کو تر و تازہ کر لیتا ہوں، اگر ایسا نہ کر سکوں تو ہوا کے اس سمندر کی تہہ ہی میں بیٹھا رہ جاؤں جو میرے اس کرۂ ارض کے گرد پھیلا دیا گیا ہے اور جس کی گہرائی چند ہزار فٹ سے زیادہ نہیں۔ سوچتا ہوں یہ کیسا بندی خانہ ہے؟ ہوا کا زندان! جو بیک وقت میری آزادی کا دشمن بھی ہے اور اس کا معاون بھی کیوں کہ اگر ہوا نہ ہو تو میں سانس کیسے لوں؟ سانس نہ لوں تو دیکھ کیسے سکوں؟ دیکھ نہ سکوں تو پھر ہوا کے اس زندان کو توڑ کر ستاروں کی دور افتادہ دنیاؤں تک کیسے جا سکوں؟ زندہ کیسے رہوں؟

اسی لئے ہاں اسی لئے اے دھرتی کے سینے سے چمٹے ہوئے لوگو! آؤ ہجرت کریں۔ ایک دوسرے کی طرف اپل بھر کے لئے ملیں اور پھر جدا ہو جائیں۔ جدا ہوں تو اس عزم کے ساتھ کہ ایک بار پھر ملاقات ہو گی۔ ہر ملاقات ہجرت کا ثمرِ شیریں ہے۔ تجدیدِ ذات ہے مگر اس کے اختصار ہی میں اس کا سارا حسن پنہاں ہے۔ کیوں کہ اگر ملاقات طویل ہو جائے تو پھر کہنے سننے کو کچھ نہیں رہتا۔ سب لوگ ایک دوسرے کے لئے کھلی کتاب بن جاتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کو حفظ ہو جاتے ہیں۔ کوئی اسرار کوئی حیرت زا بات نہیں رہتی اور جب زندگی سے حیرت منہا ہو جائے تو باقی صرف ٹیلیفون ڈائریکٹری بچتی ہے ہر شخص کا ایک ٹیلیفون نمبر مقرر ہے۔ اسرار صرف اُس وقت نمودار ہوتے ہیں جب کسی دلچسپ سے راگب نمبر سے رابطہ قائم ہو جائے مگر راگب نمبر ڈائریکٹری میں درج نہیں ہوتا۔

میرے بچپن کا دوست

آج سے تقریباً پچپن برس پہلے کی بات ہے کہ ایک روز میرے والد کو نجانے کیا سوجھی کہ مجھے سیر کے بہانے گاؤں کے پرائمری سکول میں لے گئے اور پھر وہیں چھوڑ آئے۔ میں سکول کی دیواروں پر بنی ہوئی تصاویر کو دیکھنے میں اس قدر منہمک تھا کہ والد صاحب کے چلے جانے کا مجھے علم تک نہ ہو سکا۔ اور جب علم ہوا تو مجھے یوں لگا جیسے میں کسی لق ودق صحرا میں کھڑا ہوں اور میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی زمین میں جلاد ایسی مونچھیں اُگ آئی ہیں۔ پھر دفعتاً یہ ساری مونچھیں سمٹ کر سکول کے ماسٹر صاحب کے بالائی ہونٹ کی محراب پر جمع ہو گئیں اور میں نے حیرت سے دیکھا کہ ان مونچھوں سے ذرا اوپر دو ویران سے غار منہ کھولے کھڑے تھے اور ان غاروں سے ذرا اُوپر دو سُرخ انگارہ آنکھیں تیروں کی طرح اُترتی میرے سارے بدن کو چھلنی کر رہی تھیں چنانچہ حفاظتِ خود اختیاری کے تحت میں نے بے اختیار رونا شروع کر دیا اور آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے میرے گالوں پر لڑھکنے لگے۔ ان آنسوؤں کو دیکھتے ہی اُن لال انگارہ آنکھوں میں نفرت کی ایک تیز سی کٹار اُبھری جس نے میرے آنسوؤں کی طغیانی کو اور بھی تیز کر دیا مگر عین اس وقت ماسٹر صاحب نے دائیں بائیں ایک نظر ڈال کر اپنی

جیب سے ایک نازک سی رنگین پنسل نکالی اور پھر جلدی سے میرے ہاتھوں میں تھما دی اور پنسل کے اس لمس میں خُدا جانے کیسا اعجاز تھا کہ میری پلکوں پر چمکتے ہوئے آنسو رُک گئے اور میرے ہونٹ ایک معصوم سی مسکراہٹ میں ڈوبتے چلے گئے۔ اس وقت مجھے یوں لگا جیسے میں ایک بھیگی ہوئی چلمن میں سے کسی روشن اور تابناک دنیا کا نظارہ کر رہا ہُوں۔

اس واقعے کے ایک مُدّت بعد جب میں کالج میں تعلیم پاتے ہوئے ایک روز غالبؔ کے دیوان سے متعارف ہوا تو مجھے اچانک یوں محسوس ہوا جیسے زمانے نے ایک اُلٹی زقند بھری ہے اور میں واپس گاؤں کے پرائمری سکول میں پہنچ گیا ہوں۔ غالبؔ مجھے ایک پریشان حال لڑکے کے پیکر میں نظر آیا لیکن اس طور کہ اس کی پلکیں آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھیں اور ہاتھوں نے رنگین پنسلیں تھام رکھی تھیں۔ غالبؔ سے قبل میں نے فانیؔ کا مطالعہ کیا تھا اور خود کو ایک ایسی سرزمین پر سرگرداں پایا تھا جہاں بادلوں کا سائبان تنا ہوا تھا اور یہ سائبان کسی مجبور کی آنکھ کی طرح ہولے ہولے ٹپکتا چلا جاتا تھا۔ پھر میں نے اکبرؔ کا مطالعہ کیا اور مجھے یوں لگا جیسے میں کسی جلی جُھلسی ہوئی کائنات میں دھکیل دیا گیا ہوں اور میرا ننھا سا جسم سورج کی تیز شعاعوں سے پارہ پارہ ہو گیا ہے لیکن غالبؔ کو ایک نظر دیکھتے ہی مجھے برسات کی وہ شام یاد آگئی جب موٹے موٹے بادلوں میں ایک شگاف سا پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس شگاف میں سے سورج کی زرد زرد نگاہیں ہر شے پر رنگوں کی جوالا انڈیل دیتی ہیں۔ آنسو اور تبسم ایک دوسرے سے ہم کنار ہو جاتے ہیں اور زندگی اپنے دُکھوں اور مصیبتوں کے باوجود نہایت خوبصورت، لطیف اور قیمتی نظر آنے لگتی ہے۔ مجھے غالبؔ آنسوؤں میں مسکراتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ ایک ایسا انسان نظر

آیا جسے بیک وقت غم اور خوشی کا عرفان حاصل ہو چکا ہو۔ بعض شاعر خوشی سے اس درجہ ناراض ہوتے ہیں کہ اُن کے ہاں غم کی گدلی روشنی کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا اور بعض اندر سے تو ٹوٹ پھوٹ رہے ہوتے ہیں لیکن دنیا کو دکھانے کے لئے اپنے ہونٹوں پر تبسم کی ایک جھالرسی آویزاں کر لیتے ہیں۔ غالبؔ مجھے ان دونوں قسم کے شعراء سے مختلف نظر آیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ غالبؔ کے ہاں جس طرح غم فطری ہے اس طرح تبسم بھی خود رَو ہے۔ مطلب یہ کہ غالبؔ ریاکار ہرگز نہیں۔ اُسے جب چُبھن محسوس ہوتی ہے تو رو پڑتا ہے اور جب روتے روتے محسوس کرتا ہے کہ کسی نے رنگین پنسل اس کے ہاتھ میں تھما دی ہے تو بے اختیار مسکرانے لگتا ہے۔ مسکراہٹ کا یہ تابندہ لمحہ جب بوڑھا غم نئی نویلی مسرت سے ہم کنار ہوتا ہے، ایک ایسا نایاب لمحہ ہے جو غالبؔ کو عام شعراء کی سطح سے بہت اُوپر اٹھا دیتا ہے۔ زیاں کا ایک شدید احساس اور پھر اس شدید احساس کی مضحکہ خیزی کا ایک گہرا شعور، عرفان کا یہ مقام غالبؔ ہی کو حاصل ہوا ہے اور غالبؔ کے ذریعے ہی مجھ ایسے لاکھوں انسانوں تک پہنچا ہے جو زندگی کو اس کی آلائشوں اور مصیبتوں کے باوجود ایک بیش بہا نعمت سمجھتے ہیں۔

میں نے اپنی زندگی میں غالبؔ کے علاوہ اقبالؔ کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ اقبالؔ ایک عظیم شاعر ہے اور اس کی شاعری نے لاکھوں اذہان کو منزل سے آشنا کیا ہے لیکن عجیب بات ہے کہ میں اقبالؔ سے مرعوب تو ہوا مگر بدقسمتی سے اس کے حلقہ، احباب میں شامل ہونے کی سعادت حاصل نہ کر سکا۔ ہر بار جب میں نے اقبالؔ کو پڑھا تو مجھے یوں لگا جیسے ریلوے سٹیشن پر یہ اعلان نشر ہو رہا ہو کہ "مسافرو! جلدی کرو خوابِ خرگوش سے اُٹھو۔ دوڑو، ۱۵ اَپ ٹرین کے چلنے میں اب صرف چند لمحے باقی رہ گئے ہیں" دوسری طرف غالبؔ کا مطالعہ کرتے

ہوئے میری چشمِ تصور نے دیکھا کہ اعلان کے شور اور انجن کے اضطراب سے بے نیاز کوئی شخص پلیٹ فارم کے ایک شکستہ بینچ پر اکڑوں بیٹھا کتاب کے مطالعہ میں غرق ہے۔ وہ اعلان کو سُن کر ایک لحظہ کے لئے اپنی نظریں کتاب کے اوراق سے ہٹاتا ہے اور اپنے پاس بیٹھے ہوئے دوسرے مسافر سے بڑے دھیمے اور ملائم لہجے میں پوچھتا ہے۔" جناب اس کے بعد دوسری گاڑی کے بجے آئے گی؟" اور جواب پاکر بڑے اطمینان سے دوبارہ کتاب کا مطالعہ کرنے لگتا ہے۔ غالبؔ کو کسی بات کی بھی جلدی نہیں۔ اس کے سامنے زندگی اپنی تمام تر سلوٹوں کے ساتھ بچھی ہوئی ہے۔ ہر سلوٹ ایک خواہش ہے اور ہر خواہش پر اس کا دم نکلنے کو تیار ہے مگر ساتھ ہی اُسے اس بات کا احساس بھی ہے کہ ساری سلوٹیں بے معنی ہیں اور قدرت نے انسان کے ساتھ کوئی بہت بڑا مذاق کیا ہے! غالبؔ کے سامنے نہ تو تعمیر کا کوئی منصوبہ ہے اور نہ اُسے کسی ارفع منزل ہی کی تلاش ہے۔ اُسے تو صرف اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے غرض ہے کہ آج کس دوست کا خط آیا یا شام کس طرح بسر ہوگی یا پھر اپنی ذات، اپنی انفرادیت کو زمانے کی آندھی سے محفوظ رکھنے کے لئے آج کیا تدارک کرنا ہوگا؟ غالبؔ شخصیت کے بوجھل لبادے سے گریزاں لیکن انفرادیت کے چار گرہ کپڑے کا والہ و شیدا ہے وہ کسی دوسرے کے کنویں سے اپنے باغ کو سیراب نہیں کرتا بلکہ اس کی آبیاری اپنی ذات کے مخفی چشموں سے کرتا ہے لیکن یہ ذات کیا ہے؟ ایک جہانِ ہوش ربا جو کسی تمثال دار آئینے کی طرح ہزار ٹکڑوں میں بٹ جانے کے باوجود آرزوؤں کے ایک شہر کی صورت میں قائم ہے۔ غالبؔ جب اپنے اس آئینہ خانے سے مجھے آشنا کرتا ہے تو کسی آواز کو دُگنا کر دینے والے آلے کا سہارا نہیں لیتا بلکہ چپکے سے اپنا ہاتھ میرے

شانے پر رکھ کر مجھے اس کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ میرے اندر چھپے ہوئے دیدۂ عبرت نگاہ کو متحرک ہی نہیں کرتا۔ ضرور کرتا ہے مگر ساتھ ہی اپنی ایک آنکھ میچ کر عبرت اور ندامت کے سارے تصور کو خندۂ استہزا میں بھی اُڑا دیتا ہے مجھے یہ ہمیشہ محسوس ہوا کہ غالبؔ ایک ایسا نقطہ ہے جہاں دو زمانے آ کر ملتے ہیں اور جہاں سے ایک تیسرا زمانہ اپنے سفر کا آغاز کرتا ہے یا پھر یوں کہہ لیجئے کہ غالبؔ وہ بھیگی ہوئی مسکراہٹ ہے جو جلاّدالیسی مونچھوں اور بلکتے ہوئے آنسوؤں کے تصادم سے جنم لیتی ہے اور پھر ایک نئے عہد کی علامت بن جاتی ہے۔ مجھے غالبؔ کی یہ نٹ کھٹ، معصوم اور بے داغ ادا پسند ہے کہ اس میں رفاقت کا احساس بھی ہے اور عرفان کے کوندے کی لپک بھی!

سائیکی علم دریاؤ

لحاف کا موسم ہے۔ باہر ٹھنڈی یخ بلا نے ہر شے میں اپنے پنجے گاڑ دیئے ہیں۔ شجر، حجر، پرندے، حتیٰ کہ کیڑے مکوڑے تک برف کی چھوٹی بڑی قاشوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ کمرے کے اندر کی اشیاء برف تو نہیں ہوئیں مگر سردی کے ہاتھوں تھر تھر کانپ رہی ہیں۔ میں اپنے لحاف میں قلعہ بند اندر سے تمام دروازے اور کھڑکیاں مقفل کئے ایک گہری میٹھی نیند سو رہا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے زمہریر کے ٹھنڈے مُردہ بدن میں فقط میں ہی ایک زندہ دھڑکن ہوں۔ اچانک میرے اندر سے کوئی شخص مجھے جاگنے کے لیے کہتا ہے جب میں نہیں جاگتا تو وہ مجھے ہلکے ہلکے کچوکے لگاتا ہے۔ جب میں پھر بھی بیدار نہیں ہوتا تو اپنے وحشی پنجوں سے مجھے اس بُری طرح جھنجھوڑتا ہے کہ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتا ہوں تب "وہ" مجھے اپنی بے آواز صدا میں حکم دیتا ہے کہ اسے غسل خانے تک لے جاؤں اور میں اپنے گرم و گداز بستر سے چھلانگ لگا کر سیدھا غسل خانے کی طرف لپکتا ہوں۔ چند لمحوں کے بعد وہ مجھے واپس بستر کی طرف بھاگنے کا حکم دیتا ہے کیوں کہ غُسل خانے کی سرد فضا نے اُسے کپکپی کے سپرد کر دیا ہے۔ جب میں دوبارہ لحاف میں قلعہ بند ہو جاتا ہوں تو وہ پلک جھپکنے میں نیند کی وادیوں میں اُتر جاتا ہے۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ وہ تیز تیز سانس

لے رہا ہے اور کبھی خرّاٹے بھی لینے لگتا ہے۔ مگر میں جاگ رہا ہوں اور شاید اب باقی رات آنکھوں ہی میں کاٹ دوں گا، اچانک مجھے اس شخص سے خوف سا محسوس ہونے لگتا ہے۔ میں خود سے پوچھتا ہوں کہ یہ میں کس "چیز" کے ساتھ رہ رہا ہوں؟ پیدائش سے لے کر اب تک اس نے مجھے ایک لمحے کے لئے بھی خود سے الگ ہونے کی اجازت نہیں دی۔ کہنے کو تو یہ میرا بدن کہلاتی ہے مگر کیا یہ واقعی میری ہے؟ میرا اس کے ساتھ کیا رشتہ ہے؟ شاید یہ رشتہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ میں آنکھیں میچے اس کے ہر حکم کو بجالاتا چلا جاؤں۔

میں اس "عجوبۂ روزگار" کو غور سے دیکھتا ہوں۔ گول مٹول ہڈیوں اور گوشت کا بنا ہوا ایک گیند اس کا سر پُرغرور کہلاتا ہے۔ اس گیند پر چاروں طرف بال ہی بال ہیں۔ فقط آنکھوں کے اُوپر ایک چھوٹی سی پیشانی اور آنکھوں کے نیچے دو اُبھرے ہوئے رُخسار بالوں کی یلغار سے محفوظ ہیں ورنہ ہر طرف جنگل ہی جنگل ہے۔ پھر میں دیکھتا ہوں کہ اس گیند کو چار شاخوں والے ایک دھڑ پر گویا بٹھا دیا گیا ہے۔ ہر شاخ کے سرے پر پانچ پانچ مخروطی ہڈیاں ہیں جن کے کناروں پر لمبے لمبے تیز اور نوکدار کانٹے لگے ہوئے ہیں۔ "وہ" جب ان شاخوں میں سے ایک سونڈ نما شاخ کے ذریعے کھانے کی اشیاء اٹھا کر گیند کے سب سے بڑے سوراخ کے حوالے کرتا ہے تو تیز اور لانبے دانت ان پر جھپٹتے ہیں اور لمحہ بھر میں انہیں کوٹ پیس کر دھڑ کے اندر اتار دیتے ہیں اور تمام عرصہ یہ عجوبۂ روزگار کھا جانے والی نظروں سے چاروں طرف گھورتا رہتا ہے۔ کیا یہ ڈرا ہوا ہے یا ڈرا رہا ہے؟ آج تک مجھے اس سوال کا جواب نہیں مِل سکا۔ جب میں صبح اُٹھتے ہی آئینے میں جھانکتا ہوں تو اس عفریت کی آنکھیں مجھے انتہائی نفرت یا شاید خوف سے دیکھتی ہیں جیسے میری آگاہی

کو بالکل ناپسند کر رہی ہوں۔

لیکن میرے اور اس کے درمیان خوف کا یہ رشتہ ابتدا میں بالکل نہیں تھا۔ یہ میں اپنے بچپن کی بات کر رہا ہوں۔ اُس وقت میں تو جینے تھا ہی نہیں، صرف وہ ہی وہ تھا۔ اور میں؟... میں تو زیادہ سے زیادہ اس کا محض ایک عضو تھا۔ اس سمے وہ پوری طرح بیدار۔ پوری طرح چاق و چوبند تھا، وہ سرتاپا جبلّت تھا۔ اندھا، بہرہ، گونگا لیکن ایک مجسّم اضطراب ایک مجسّم کرب! شوپنہار کی "خواہش" کی طرح اس کا کوئی فلسفیانہ رُخ ابھی سامنے نہیں آیا تھا اور نہ وہ سدھیارتھ کی خواہش کی طرح دُکھ کی علامت ہی بنا تھا۔ اس وقت تو وہ ازسرتاپا ایک جسم تھا جس کی ساری حسّیات پوری طرح بیدار تھیں۔ اس وقت میرا یہ ساتھی ہم زاد، میرا یہ بدن، ایک تپتی، ہونکتی، کھولتی ہوئی "خواہش" کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ ایک صبا رفتار، تُند خو گھوڑا تھا جو زین کے لمس تک سے آشنا نہیں تھا اور نہ جس کی زبان نے کبھی کسی کانٹے دار چمڑے کی جیب ہی کو چکھا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ "میں" اس وقت سویا پڑا تھا ورنہ اُسے اس کی ننگی حالت میں دیکھ کر میں شاید خوف سے بے حال ہو جاتا۔

پھر نہ جانے کب اور کیسے لیکن اچانک ایک روز میں نے محسوس کیا کہ کسی نادیدہ ہاتھ نے مجھے اس کی پیٹھ پر سوار کر دیا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب کسی اَن گھڑ جنگلی گھوڑے کی پُشت پر زین کَس دی جاتی ہے اور اس پر ایک سوار بٹھا دیا جاتا ہے اور پھر یکایک "ارگڑا" ہٹا کر گھوڑے کو آزاد کر دیتے ہیں تو کس طرح یہ گھوڑا اپنی پُشت پر ایک نامانوس سے بارِ گراں کو محسوس کر کے کُودتا، دولتیاں مارتا، ہنہناتا اور بے تحاشہ بھاگتا ہے۔ اتنی تُندی اور وحشت کے ساتھ کہ بالآخر سوار زمین پر آ رہتا ہے۔ بالکل اسی

طرح اپنی پیٹھ پر میرے نامانوس بوجھ کو محسوس کر کے لڑکپن کے اس وحشی گھوڑے نے جو تماشا دکھایا وہ مجھے آج تک یاد ہے۔ یہ نہیں کہ خونخوار گھوڑا کودتا اور ہنہناتا رہا اور میں زین کے قلعے میں محفوظ بیٹھا رہا۔ میں تو کئی بار اوندھے منہ زمین پر گرا۔ لیکن میں بھی بہت ضدی تھا۔ ہر بار گرنے کے بعد لپک کر دوبارہ گھوڑے پر سوار ہو جاتا تھا۔

لڑکپن کے بعد جوانی آئی تو اسپ تیز گام نے مزید پر پرزے نکال لئے مگر اب سوار بھی زیادہ تجربہ کار ہو چکا تھا۔ شُدہ شُدہ گھوڑے نے زین اور سوار دونوں کو برداشت کر لیا۔ پھر وقت کو جیسے پَر سے لگ گئے اور زمانہ کسی افعی کی طرح کروٹوں پر کروٹیں لیتا چلا گیا تا آنکہ آہستہ آہستہ سوار کے قوائے نفسانی مضمحل ہونے لگے اور زین بھی پرانی ہو گئی۔ تب اس خونخوار گھوڑے نے بھی اپنا چولا بدلا۔ اس کی تو گویا کایا کلپ ہو گئی۔ پہلے وہ تند خو ضرور تھا لیکن کم از کم اس کا مزاج اور رویہ تو متعین تھا اور یہ اندازہ لگانا کچھ ایسا مشکل نہیں تھا کہ ایک خاص صورتِ حال میں وہ کس قسم کے ردِ عمل کا مظاہرہ کرے گا۔ مگر اب صورتِ حال بالکل تبدیل ہو گئی۔ اب یہ گھوڑا نہیں تھا بلکہ گھوڑے کی بدروح تھا۔ ایک آسیب جو زیادہ تر سر کی بالائی منزل میں رہتا اور اس منزل کی دونوں کھڑکیوں میں سے اکثر و بیشتر اپنی سُرخ انگارا آنکھوں سے مجھے گھورتا اور پھر لفظوں سے نا آشنا ایک بے نام اور بے آواز زبان میں احکامات نشر کرنے لگتا۔

اور اب میں ہمہ وقت اس آسیب کے ساتھ رہتا ہوں۔ اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے سوتے جاگتے وہ پیرِ تسمہ پا کی طرح مجھ پر سوار ہے۔ پہلے میں اس کا راکب تھا۔ اب وہ میرا راکب ہے یا شاید راکب میں ہی ہوں لیکن باگ اب میرے بجائے اس کے ہاتھ میں ہے اور میری حیثیت ایک "اعزازی سوار" کے سوا کچھ نہیں رہی۔ لیکن کیا واقعی؟ ... کیوں کہ

آج رات جب اس نے مجھے جگایا کہ اُسے غسل خانے تک لے جاؤں تو اچانک مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ یہ "ذاتِ شریف" تو میرا محتاج ہے اور میرے بغیر ایک قدم اٹھانے پر بھی قادر نہیں۔ تب میں نے بڑے فخر کے ساتھ ایک پُر اعتماد لہجے میں قدرے تُنک کر اس سے پوچھا۔

"بولو! کیا میرے بغیر تم رہ سکتے ہو؟؟

میری بات سُن کر وہ بے اختیار ہنہنایا اور دیر تک ہنہناتا رہا اور پھر معلوم ہے اس نے مجھے کیا جواب دیا ... بولا:

"نہیں! میں اپنے سائیس کے بغیر کیسے رہ سکتا ہوں!"

سو بات ختم ہوگئی۔ اب میری اس کی بول چال بند ہے۔ میں سر جھکائے، ہونٹوں پر چُپ کی مُہر سجائے دن رات اس کے احکامات بجالاتا ہوں اور جب ذرا سانس لینے کی فرصت ملتی ہے تو سوچتا ہوں کہ میری عمرِ عزیز تاحال تین واضح اَدوار سے گزری ہے۔ پہلا دَور جب وہ میرا ہم زاد تھا یا شاید میں اس کا ہم زاد تھا۔ ہم گویا یک جان یک قالب تھے اور یہ قالب ایک بدمست، خونخوار تیز و طرار گھوڑے کا تھا۔ دوسرا دَور طلوع ہوا تو میں قالب سے باہر آکر گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا۔ اب وہ میرا گھوڑا تھا اور میں ہاتھ کی جُنبش اور ایڑی کے ٹھوکے اور چابک کی ضرب سے اسے مستقیم راستے پر چلانے کی کوشش میں مصروف تھا اور اب آخری دَور میں میں اس کا سائیس ہوں۔ دن رات اس کے ناز اُٹھاتا ہوں ہمہ وقت اس کی خدمت پر مامور ہوں۔ اسے نہلاتا اور نہاری کھلاتا ہوں۔ اس کے تھان کو صاف کرتا ہوں۔ اس کی بیماریوں پر کُڑھتا ہوں۔ اس سے خوف کھاتا ہوں۔ اس کے جاں بحق ہونے کا منتظر ہوں!!

ہینڈ بیگ

فطرت کی نظروں میں کفرانِ نعمت سب سے بڑا گناہ ہے۔ چنانچہ جب وہ دیکھتی ہے کہ کسی نعمت کا کفران ہو رہا ہے تو اسے واپس لے لیتی ہے۔ انسانی جسم کو اس نے بڑی محبت اور شفقت سے ایک کارآمد عضو عطا کیا تھا۔ مگر جب انسان نے "ہمچو ما دیگرے نیست" کے نشے میں سرشار ہو کر اسے استعمال کرنے ہی سے انکار کر دیا تو فطرت نے نہ تو غیظ و غضب کا مظاہرہ کیا نہ شکوہ و شکایت تک ہی نوبت آنے دی۔ اس نے کیا تو بس یہ کہ انسان سے یہ عضو ہی واپس لے لیا۔ آج صورت یہ ہے کہ اس کا ٹنڈ تو انسانی جسم میں موجود ہے لیکن اصل عضو کبھی کا غائب ہو چکا ہے۔ مگر انسان بھی بڑا کایاں ہے۔ اس نے اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے اِس عضو کے چھن جانے کا خیر مقدم کیا مگر اس کی افادیت کا اقرار یوں کر لیا کہ اپنے جسم کے ساتھ ایک ایسی چیز چپکا لی جو کسی صورت بھی چھن جانے والی شے سے کم مفید اور کارآمد نہیں تھی۔ میرا اشارہ ہینڈ بیگ کی طرف ہے جو انسانی تہذیب کی ابتدا ہی سے انسان کے ساتھ منسلک رہا ہے۔ کبھی اس کا نام "بورا" تھا۔ پھر وہ "تھیلا" کہلایا جانے لگا۔ اس کے بعد "زنبیل" مشہور ہوا۔ جدید دور میں اسے ہینڈ بیگ کا نام ملا ہے۔ آغازِ کار میں تو انسان نے اسے صرف ضرورت کے موقعوں پر استعمال کیا تھا مگر پھر جب عمر و عیار نے اسے اپنے زرہ بکتر کا حصہ

بنالیا تو یہ ہماری تہذیب کا بھی حصّہ بن گیا۔ اب صورت یہ ہے کہ انسان نے اسے اپنے بدن کی توسیع قرار دے لیا ہے۔ ہینڈ بیگ کا لفظ ہی اس بات کا گواہ ہے کہ یہ انسان کا "تیسرا ہاتھ" ہے۔ مگر ایک ایسا ہاتھ جس کے آخری سرے پر پانچ مخروطی کھمبوں کے بجائے ایک ایسی شے باندھ دی گئی ہے جس کے اندر اس کی پوری تہذیب بند ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہینڈ بیگ انسان کا ایک اضافی عضو ہی نہیں، اس کی یادداشت، اس کا ڈاکٹر، اس کا ضمیر اور پی اے بھی ہے۔ ہینڈ بیگ کے بغیر آج کا انسان ایسے ہی ہے جیسے وہ شخص جس کا ایک بازو کٹ گیا ہو۔

میں جب سفر پر روانہ ہوتا ہوں تو کئی بار اپنی ٹوپی گھر بھول جاتا ہوں۔ اسی طرح کئی بار مجھے خیال تک نہیں رہتا کہ تھرماس کے بغیر سفر کرنا ایسے ہی ہے جیسے کوہان کے بغیر صحرا عبور کرنا۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے ہینڈ بیگ کے بغیر ہی سفر پر جانے کی جرأت کر لی ہو۔ بھلا کوئی شخص اپنے جسم کے کسی عضو کو ساتھ لے جانے میں کوتاہی برت سکتا ہے؟ مگر جسمانی اعضا کا تو یہ قصّہ ہے کہ آپ کو یاد بھی نہیں رہتا کہ یہ پُرزے آپ کے بدن پر کس دیئے گئے ہیں۔ دوسری طرف ہینڈ بیگ کا معاملہ یہ ہے کہ ہر چند یہ آپ کو اپنے جسم کا ایک عضو دکھائی دیتا ہے، تاہم آپ اسے خود سے الگ اور جُدا بھی محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ کبھی کبھی آپ بڑے معترضی انداز میں اس کے پُراسرار باطن میں جھانکنے اور اس کے مندرجات کو طشت از بام کرنے میں ایک عجیب سی خوشی بھی محسوس کرتے ہیں۔ مگر میرا قصّہ یہ ہے کہ مجھے ہینڈ بیگ کو بے نقاب کرنے میں خوشی بھی ہوتی ہے، ساتھ ہی خوف بھی محسوس ہوتا ہے۔ خوشی اس لئے کہ ہینڈ بیگ کھولنے پر مجھے بہت سی ایسی چیزوں سے دوبارہ ملاقات کا شرف حاصل ہوتا ہے جو عرصہ ہوا داغِ مفارقت دے گئی تھیں۔ خوف اس لئے کہ بعض اوقات بیگ میں سے کچھ ایسی چیزیں بھی برآمد ہو جاتی ہیں جنہیں دیکھتے ہی میں ایک اعصابی تشنج میں مبتلا ہو جاتا ہوں مثلاً کسی

انشورنس ایجنٹ کا کارڈ، کسی رشتہ دار کا محبت نامہ یا کسی کہنہ مشق شاعر کی تازہ ترین تصویر وغیرہ تاہم اکثر و بیشتر خوشی کا عنصر خوف کے عناصر پر غالب ہی رہتا ہے۔ ویسے بھی ہینڈ بیگ ایک پردہ در پردہ اور نقاب اندر نقاب شے ہے۔ بالکل ایک نظم کی طرح! آپ جب اسے کھولتے ہیں تو سب سے پہلے اس کے اندر کی اشیاء کے وجود کو محسوس کرتے ہیں۔ پھر اس کی مخصوص خوشبو آپ کا سواگت کرتی ہے، اس کے بعد آپ کے بھیتر کا غوطہ خور اس کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے ATLANTIS کو تلاش کرنے کے لئے اُتر تا ہے۔ یہ ایک انتہائی خطرناک اقدام ہے کیونکہ اس کے دوران اگر ایک آدھ سانس کا بھی ہیر پھیر ہو جائے تو پھر سطح پر آنا بہت مشکل ہے۔ مگر غوّاصی کا یہ عمل اس قدر مسرت افزا اور خیال افروز ہے کہ انسان بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے کے لئے بھی تیار ہو جاتا ہے۔ مجھے جب کبھی کوئی بہت اچھی نظم پڑھنے کو ملی ہے تو میں نے سب سے پہلے اس کے بدن کو چھُوا ہے اور مجھے محسوس ہوا ہے کہ تشبیہیں، استعارے، تلازمات، مناظر، کردار، واقعات اور اشیاء یہ سب نظم کے اعضاء ہیں۔ جب میں انہیں چھُوتا ہوں تو دراصل نظم کے جسم کو مَس کر رہا ہوتا ہوں۔ یہ عمل بجائے خود انتہائی لذت بخش ہے لیکن پھر دوسرے ہی لمحے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ سطح پر بکھری ہوئی یہ تمام اشیاء تو پانی کی تہہ میں بیٹھی ہوئی اشیاء کا محض عکس ہیں۔ وہ سطح پر ضرور دکھائی دیتی ہیں جب کہ حقیقتاً کہیں اور ہیں اس اعتبار سے ہر اچھی نظم ایک سُراب ہے۔ پہلی نظر میں آپ کو پانی ہی پانی نظر آتا ہے دوسری نظر میں ذرّات ہی ذرّات دکھائی دیتے ہیں لیکن دراصل یہ سونے کے ذرّات ہیں جو ہزاروں لاکھوں برس کے فطری عمل سے وجود میں آئے ہیں۔ ایک بڑے شاعر کا یہی سب سے بڑا کمال ہے کہ وہ اپنے قاری کو ہست کے لق و دق سُراب میں لا کھڑا کرتا ہے۔ وہ بظاہر اسے پانی کا منظر دکھاتا ہے لیکن بباطن ایک اور ہی جہانِ معنی کی جھلک دکھاتا ہے۔ میں جب اپنے

ہینڈ بیگ کو کھولتا ہوں تو اس توقع کے ساتھ کہ یہ بھی ایک اچھی نظم کی طرح مجھے چوتھے کھونٹ کی سیر کرائے گا مگر خود کو ریاضی کے سوال کی طرح حل نہیں ہونے دے گا اور اکثر و بیشتر مجھے اپنے اس اقدام میں کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔ ہینڈ بیگ کے اندر کئی خانے ہوتے ہیں، چھوٹے بھی اور بڑے بھی، تنگ بھی اور کھلے بھی، بعض پر تالے اور بعض پر ZIP ہوتے ہیں جو دیکھنے والے کے تجسس کو برانگیختہ کرتے ہیں۔ انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ ہر چھپی ہوئی شے کو طشت از بام کرنے کا آرزومند ہے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ ہر وہ شے جو مستور تو ہو مگر پوری طرح چھپی ہوئی نہ ہو، انسانی تجسس کے لئے ایک تازیانہ کا کام دیتی ہے۔ مقفل اور مہر بند چیزوں میں دلچسپی تو صرف چوروں ہی کو ہو سکتی ہے۔ مگر کوئی شے جس کا تالہ سہواً یا عمداً کھلا چھوڑ دیا گیا ہو، ایک عام سے انسان کو بھی مائل بہ تجسس کر سکتی ہے اور وہ اپنی اوّلین فرصت میں اس پر جھپٹنے کی آرزو میں سرشار ہو جاتا ہے۔ میرے لئے بھی ہینڈ بیگ کی سب سے بڑی کشش ہے کہ اس کے متعدد نیم وا خانے مجھے دعوتِ نظارہ تو دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی نظارے سے محروم بھی رکھتے ہیں۔ وہ تجسس کو ابھارتے ہیں لیکن پُراسراریت کو ختم ہونے کی اجازت نہیں دیتے اور سچ پوچھیئے تو نظم ہو یا ہینڈ بیگ اس کی اصل خوبی ہی وہ تجسس ہے جو سدا تشنہ لب رہتا ہے اور جس کے لئے سیرابی موت کے مترادف ہے۔

یہ نہیں کہ میں ہینڈ بیگ کی کاروباری حیثیت سے آشنا نہیں ہوں بلکہ مجھ سے زیادہ اس کی کاروباری حیثیت سے اور کون آشنا ہوگا کیوں کہ نہ صرف یہ کہ ہینڈ بیگ سے میری رفاقت دو چار برس کی بات نہیں پوری نصف صدی کا قصہ ہے بلکہ یہ بھی کہ میں نے کبھی اپنے ہینڈ بیگ کو مردہ کاغذوں کی لحد نہیں بننے دیا جیسا کہ اکثر پروفیسر حضرات کرتے ہیں۔ میرے لئے تو میرا ہینڈ بیگ اتنا ہی وسیع اور پیچیدہ ہے جتنا کسی ملک کا سیکرٹریٹ

لائبریری پٹنہ

جس میں صحت، معاشیات، تعلیم، ثقافت، سیاحت، دفاع اور تعلقاتِ عامہ ایسے متعدد محکموں کے مرکزی دفاتر انتہائی ذمہ داری سے اپنے سارے فرائض پورا کر رہے ہوتے ہیں۔ مثلاً اکثر ایسے ہوا کہ گاڑی میں سفر کرتے ہوئے جب میرے عزیز ترین دوست ج۔ ا۔ مسلسل پانچ گھنٹے بے تکان بولتے چلے گئے تو میں نے اپنے ہینڈ بیگ کے شعبۂ صحت سے پیراسیٹامول کی درجن بھر گولیاں حاصل کر کے ان میں سے ایک دو تو اپنے دوست کے کھلتے اور بند ہوتے ہوئے منہ میں ڈال دیں اور باقی گولیاں خود نگل لیں۔ اسی طرح جب کسی ریستوران میں کسی ادبی موضوع پر گرم گہری گفتگو کا آغاز ہوا اور پہلو میں بیٹھے ہوئے میرے کسی کرم فرما نے میری پسلی میں ایک معنی خیز ٹھوکا دیا تو میں نے فوراً ہینڈ بیگ کے شعبۂ معاشیات سے مدد طلب کی اور اپنے پہلو سے بلائے ناگہانی کو رخصت کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرے ہینڈ بیگ کے شعبۂ علم و ادب پر ہمیشہ سب سے زیادہ بوجھ پڑا ہے۔ میرے اکثر کرم فرما مجھے اپنا تازہ کلام بذریعہ ڈاک بھجوا دیتے ہیں لیکن میرے بعض کرم فرما ایسے بھی ہیں جو ڈاک پر روپیہ ضائع کرنے کے بجائے ہمیشہ اِس تاک میں رہتے ہیں کہ میں کسی تقریب میں یا ویسے ہی سرِ راہے ان کی گرفت میں آجاؤں اور وہ مجھ پر اپنے مضامینِ نظم و نثر لاد دیں اور میں اکثر ان کے قابو میں آجاتا ہوں۔ چنانچہ میرے ہینڈ بیگ کا شعبۂ علم و ادب ہمیشہ پھولا ہی رہتا ہے۔ رہا "تعلقاتِ عامہ" والا خانہ تو وہ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں۔ اس میں لوگوں کے وزٹنگ کارڈ، ان کی تازہ ترین رنگین تصویریں ایڈریس اور جانے کیا کچھ بھرا رہتا ہے۔ جب کچھ عرصہ گزر جاتا ہے تو میں قطعاً بھول جاتا ہوں کہ وزٹنگ کارڈ پر جن صاحب کا پتہ درج ہے وہ کون ہیں اور انہوں نے کیوں مجھے اپنا کارڈ عنایت کیا تھا۔ اسی طرح مجھے یہ تک یاد نہیں رہتا کہ تصویر میں جن صاحب

کا چراغِ رُخِ زیبا مجھے انتہائی پیار سے دیکھ رہا ہے وہ کس سلسلے میں میرے ہینڈ بیگ میں تشریف لائے تھے مگر اس سب کے باوجود نہ تو میں نے آج تک ان انتہائی خوبصورت وزٹنگ کارڈوں کو ضائع کیا ہے اور نہ ان جاذبِ نظر تصویروں کی جُدائی ہی برداشت کی ہے۔

اور اب تو میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ شائد میرا ہینڈ بیگ بھی محض ایک سُراب ہے۔ یہ شاید عکس ہے اس ہینڈ بیگ کا جسے میں نے اپنے سر کے اندر کہیں چُھپا رکھا ہے اور جس میں پوری نسلِ انسانی کی کامرانیاں اور شکستیں، نیکیاں اور خباثتیں اپنے اپنے شعبوں میں نہایت قرینے سے براجمان ہیں۔ اگر یوں ہے تو پھر کیا یہ مناسب نہیں کہ میں سُراب اور حقیقت میں حدِ فاصل قائم کروں۔ نقلی ہینڈ بیگ کو ترک کر کے اصل ہینڈ بیگ کی طرف آؤں اور دوسروں سے ملاقات کرنے کے بجائے خود سے معانقہ کروں؟ مناسب تو یہی ہے مگر ذرا ٹھہریں مجھے لحظہ بھر کے لئے اپنے ہینڈ بیگ میں جھانک لینے دیں۔ کیا خبر اصلی ہینڈ بیگ بھی اس کے اندر ہی کہیں موجود ہو!

"کبھی دوسرا کنارا بھی تو دیکھنا چاہیئے!" بعد ازاں جب ایک روز اصغر ندیم سید سے ملاقات ہوئی تو مَیں نے کہا کہ صاحب! آپ نے تو ایک لمحۂ خود فراموشی میں انشائیہ کے اصل مزاج ہی کو پیش کر دیا کیوں کہ انشائیہ "دوسرے کنارے" کو دیکھنے ہی کی ایک کاوش تو ہے۔ مُراد محض یہ نہیں کہ آپ دریا کا پُل عبور کر کے دوسرے کنارے پر پہنچیں اور پھر اس سے لطف اندوز ہوں۔ اپنی جگہ یہ بات بھی غلط نہیں۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ جب آپ دوسرے کنارے پر پہنچتے ہیں تو آپ کا ہر روز کا دیکھا بھالا "پہلا کنارا" دوسرا کنارا بن کر آپ کے سامنے ابھر آتا ہے اور آپ اسے حیرت اور مسرت کے ساتھ دیکھنے لگتے ہیں جیسے پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔ انشائیہ نگار بالکل یہی کچھ کرتا ہے۔ وہ شے یا منظر کو سامنے سے دیکھنے کے بجائے عقب سے اس پر ایک نظر ڈالتا ہے۔ یوں اس کی اُس معنویت کو گرفت میں لے لیتا ہے جو ہمہ وقت ایک ہی مانوس زاویے سے مسلسل دیکھنے کے باعث اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ مثلاً ابھی ابھی مَیں نے دریا کا ذکر کیا تو معاً میرا ذہن پانی کی طرف منتقل ہو گیا۔ پانی سے ہر شخص اس درجہ مانوس ہے کہ کبھی اس نے پانی کو "دوسرے کنارے" سے دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی لیکن مَیں نے ذہن کے دوسرے کنارے سے اس پر ایک نگاہ ڈالی ہے تو اچانک مجھ پر اس بات کا انکشاف ہوا ہے کہ پانی ہمارے کرۂ ارض کی کرنسی ہے۔ جب بارشوں کا زمانہ آتا ہے تو "پانی" افراطِ زر کا منظر دکھاتا ہے۔ تب وہ خود تو سستا ہو جاتا ہے مگر باقی اشیا مہنگی ہو جاتی ہیں۔ جب پانی بہت زیادہ ہو جائے تو طوفانِ نوحؑ کی طرح ساری دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ تب پانی سے اُبھری ہوئی ایک معمولی سی پہاڑی بھی سونے کے پہاڑ جتنی قیمتی نظر آتی ہے۔ دوسری طرف جب برفانی یلغار کا زمانہ آتا ہے تو پانی برف کے Fixed Deposits میں منتقل ہو جاتا ہے اور پانی کی کرنسی انقباضِ زر کا منظر دکھانے لگتی ہے۔ تب پانی مہنگا اور باقی تمام اشیا سستی ہو جاتی ہیں۔ یہ "دوسرے کنارے" کا کرشمہ ہے کہ اس نے مجھے دیکھنے کا ایک نیا زاویہ عطا کیا ہے۔

——— وزیر آغا

vrary

سیمانت پرکاشن

۹۲۲۔ کوچہ رو بیلا۔ ترا ہا بہرام
دریا گنج۔ نئی دھلی۔ ۱۱۰۰۰۲